www.cpsglobal.org

July 2015 • No. 464 • Rs. 20

کھوئے ہوئے کو بھلانا آپ کو یہ موقع دیتا ہے کہ
آپ نہ پائی ہوئی چیز کو دوبارہ جدوجہد کر کے پاسکیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز


Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 011-41827083, 46521511
Fax: 011-45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹ 20
One year ₹ 200
Two years ₹ 400
Three years ₹ 600
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051


جولائی 2015

## فہرست

# روزہ اور تقویٰ

قرآن میں رمضان کے روزے کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (2:183) یعنی تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے اگلوں پر فرض کیا گیا تھا، تا کہ تم پرہیز گار بنو۔

قرآن کی اِس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ روزہ کا فعل اپنے آپ میں ایک نہایت بابرکت فعل ہے، اور رمضان کا مہینہ اتنا مبارک مہینہ ہے کہ جو شخص اِس مہینہ میں روزہ کی نیت سے صبح سے شام تک کھانا پینا چھوڑ دے تو وہ اِس ترک طعام کی بنا پر عظیم ثواب کا مستحق بن جائے گا۔ اِس کے بجائے آیت میں یہ فرمایا گیا کہ روزہ کا مقصد یہ ہے کہ تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو (لعلکم تتقون)۔ گویا روزہ کی ایک صورت (form) ہے، اور تقویٰ اُس کی روح (spirit) ہے۔ روزہ برائے تقویٰ ہے، نہ کہ برائے جوع۔

تقوی کا لفظی مطلب ہے بچنا۔ روزہ سے مراد صرف کھانے اور پینے سے بچنا نہیں ہے بلکہ ہر اس چیز سے بچنا ہے، جس کو شریعت میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ گویا کہ روزہ میں ترک طعام برائے ترک طعام نہیں ہے، بلکہ وہ ترک ممنوعات کے لیے تربیت کا ایک کورس ہے۔ حدیث کے الفاظ میں جو شخص کھانے پینے کا روزہ رکھے، مگر وہ دوسری قابل پرہیز چیزوں سے اپنے آپ کو نہ بچائے، اُس کو اپنے روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ اور نہیں ملے گا (لیس لہ من صیامہ إلا الجوع) ابن ماجہ، حدیث: 1380۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہ رمضان کے مہینہ کا روزہ، اِس بات کی تربیت ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ڈسٹریکشن (distraction) کی تمام صورتوں سے بچائے۔ وہ اپنے اندر یکسوئی کا مزاج پیدا کرے۔ وہ اپنی عادتوں پر کنٹرول کرے، اور پوری طرح با مقصد زندگی گزارنے کی کوشش کرے۔ ڈسٹریکشن سے اپنے آپ کو بچانا مومن کے لیے ضروری ہے، کیوں کہ ایسا کرنے کے بعد ہی مومن اِس قابل بنتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر متعلق مصروفیتوں سے بچائے، اور با مقصد انداز میں اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کرے۔

# روزہ برائے ترک ممنوعات

ایک حدیث رسول میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا اجر دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھتا ہے۔لیکن روزہ (صوم) میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔اس عظیم اجر کا سبب یہ بتایا کہ روزہ دار، اللہ کے لئے (لأجل الله) اپنی شہوات کو چھوڑ دیتا ہے (مسند احمد، حدیث نمبر: 9714)

اس حدیث کے مطابق، روزہ کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ ترک ممنوعات کی تربیت ہے۔ زندگی میں 'ترک' (چھوڑنے) کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں اختیار سے زیادہ 'ترک' کی اہمیت ہوتی ہے۔'ترک' کے آئٹم اگر ننانوے فیصد ہیں تو اختیار کا آئیٹم ایک فی صد ہے۔ اختیار کے آئٹم کی فہرست بنائی جاسکتی ہے، لیکن 'ترک' کے آئٹم کی فہرست بنانا ممکن نہیں۔

انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے لئے اختیار ایک کم مشکل کی چیز ہے۔اِس کے برعکس 'ترک' کی مشکل بہت زیادہ ہے۔مثلاً حج میں گھر سے نکل کر مکہ کا سفر کرنا، اور حج کے مراسم ادا کرنا نسبتاً کم مشکل ہے۔اِس کے برعکس، قرآن کی اِس آیت پر عمل کرنا بے حد مشکل ہے، جس میں کہا گیا ہے: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (2:197) یعنی حج کے دوران نہ کوئی فحش بات کرنی ہے اور نہ گناہ اور نہ لڑائی جھگڑا۔

روزہ اِسی مشکل کام کی تربیت ہے۔رمضان میں ایک مہینہ کا روزہ دراصل ایک علامتی 'ترک' ہے۔رمضان کے مہینہ میں ایک علامتی 'ترک' کے ذریعہ لوگوں کے اندر یہ نفسیات جگائی جاتی ہے کہ وہ ترک کی اہمیت کو سمجھیں، وہ ترک کے بارے میں حساس بنیں، وہ ترک کلچر کو اپنی پوری زندگی میں اختیار کریں۔اسی ترک کلچر پر لوگوں کو ابھارنے کے لئے یہ فرمایا گیا کہ اس عمل پر اللہ کا بے حساب اجر ہے، جس طرح کلمہ میں إلا الله سے پہلے لا إله آتا ہے، اسی طرح مطلوب عمل سے پہلے غیر مطلوب اعمال کا درجہ ہے۔غیر مطلوب اعمال کو ترک کرنے کے بعد ہی آدمی اس قابل بنتا ہے کہ وہ درست طور پر مطلوب عمل انجام دے سکے۔

# قرآن کتابِ تدبر

قرآن کی سورہ ص کی ایک آیت یہ ہے: كِتَٰبٌ أَنزَلْنَٰهُ إِلَيْكَ مُبَٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوٓا۟ ءَايَٰتِهِۦ وَلِيَتَذَكَّرَ أُو۟لُوا۟ ٱلْأَلْبَٰبِ.(38:29) یعنی یہ ایک برکت والی کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگ اِس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی باتوں کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جو قرآن کا مطالعہ تدبر کے ساتھ کرے۔ صرف لفظی تلاوت کے ذریعہ قرآن کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ مزید یہ کہ تدبر کے لیے تیار ذہن (prepared mind) درکار ہے۔ جو شخص قرآن کو سمجھنا چاہتا ہے، اس کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو ایک تیار ذہن بنائے۔ اس کے بعد ہی وہ قرآن کو حقیقی طور پر سمجھ سکے گا۔ اپنے آپ کو تیار ذہن بنانے کے لیے جو شرطیں درکار ہیں، ان میں سے ایک ضروری شرط تقویٰ (2:282) ہے۔ متقی انسان ایک سنجیدہ (sincere) انسان ہوتا ہے۔ سنجیدگی کے بغیر کوئی شخص قرآن کو سمجھ نہیں سکتا۔

قرآن میں عقل کے مترادف کم سے کم چھ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں — عقل، فؤاد، لب، قلب، حجر، نہیٰ۔ ان کے سوا قرآن میں اور بہت سے الفاظ ہیں، جو بالواسطہ طور پر عقل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً سمع اور بصر وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تمام آیتیں عقل پر مبنی ہیں، کچھ آیتیں براہِ راست طور پر اور کچھ آیتیں بالواسطہ طور پر۔

مثلاً إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُو۟لُوا۟ ٱلْأَلْبَٰبِ (13:19) اور إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّأُو۟لِى ٱلنُّهَىٰ. (20:54) جیسی آیتوں میں براہِ راست طور پر عقل کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس طرح کی آیتیں قرآن میں کثرت سے ہیں۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ اگر تم قرآن کو یا قرآن کے پیغام کو سمجھنا چاہتے ہو تو اپنی عقل (reason) کو استعمال کرو۔ عقل کے استعمال کے بغیر تم قرآنی آیتوں کے حقیقی مفہوم تک نہیں پہنچ سکتے۔

جہاں تک عقل کے بالواسطہ حوالے کی بات ہے، اس سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے۔ مثلاً قرآن

کی پہلی آیت یہ ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1)۔اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اس اللہ کی حمد کرو جو سارے عالم کا رب (Lord) ہے۔اس سے واضح ہے کہ کوئی شخص اللہ کی حقیقی حمد، اسی وقت کرسکتا ہے، جب کہ اس نے اللہ کو رب العالمین کی حیثیت سے دریافت کیا ہو۔اس قسم کی دریافت کسی آدمی کو صرف عقل کے استعمال کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔

اسی طرح قرآن کی آخری سورہ یہ ہے کہ انسان اور جن کے وسوسہ کے شر سے اپنے آپ کو بچاؤ (الناس)۔ یہاں ظاہر ہے کہ وسوسہ ایک غیر محسوس چیز ہے۔ وسوسہ کو چھوکر یا دیکھ کر نہیں جانا جاسکتا، وسوسہ کے شر سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے عقل کو استعمال کرکے وسوسہ کو دریافت کرے۔اِس طرح قرآن کی یہ آیت عقل کے بالواسطہ حوالے کی ایک مثال ہے۔

یہی معاملہ قرآن کی تمام آیتوں کا ہے۔مثلاً قرآن میں مومن کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں (2:3)۔غیب پر ایمان صرف اس شخص کو حاصل ہوسکتا ہے، جو غیبی حقیقتوں کو یقین کے درجے میں دریافت کرے، اور یہ بات صرف عقلی غور وفکر کے ذریعہ ممکن ہے۔اسی طرح، مثلاً قرآن میں حج کے حکم کے ذیل میں یہ الفاظ آئے ہیں: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (2:197)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حج تو ایک عبادت کا فعل ہے، اس کا جدال سے کیا تعلق۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کی عبادت کے دوران بہت سے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ساتھ رہنے کی بنا پر فطری طور پر آپس میں اختلافات (differences) پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے حاجی کو چاہئے کہ وہ اختلاف پر صبر کرے، وہ اس کو جدال تک پہنچنے نہ دے۔آیت کا یہ پہلو بھی عقل کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح قرآن کی ایک سورہ میں معاہدۂ حدیبیہ کا صراحتاً ذکر کیے بغیر یہ آیت آئی ہے: إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِيْنًا (48:1)۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاہدہ حدیبیہ میں تو فریقِ ثانی سے یک طرفہ شرطوں پر صلح کرکے رسول اور اصحاب رسول مدینہ واپس آگئے تھے، پھر اس کا فتح مبین سے کیا تعلق۔آیت کا یہ گہرا مفہوم صرف اس وقت معلوم ہوتا ہے، جب کہ آدمی آیت پر تاریخ کی روشنی

میں غور وتدبر کرے، اور یہ عقل کے استعمال کے بغیر نہیں ہوسکتا، وغیرہ۔

قرآن میں کل ایک سو چودہ (114) سورتیں ہیں۔ اگر ان تمام سورتوں کو پڑھا جائے تو ان میں کہیں بھی قانون کی زبان نہیں ملے گی، بلکہ دعوت اور تذکیر کی زبان ملے گی، اور دعوت اور تذکیر کے معاملے کو درست طور پر صرف اس وقت سمجھا جاسکتا ہے، جب کہ اس کو عقل کا استعمال کرکے جاننے کی کوشش کی جائے۔

قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قرآن معروف معنوں میں کوئی فقہی کتاب یا قانون کی کتاب نہیں ہے۔ قرآن میں کہیں بھی وہ اسلوب استعمال نہیں کیا گیا ہے جو فقہ کی کتابوں یا قانون کی کتابوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔ قرآن کے اسلوب کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ قرآن وزڈم کی کتاب (book of wisdom) ہے۔

## رمضان کا مہینہ

رمضان کا مہینہ، نزولِ قرآن کا مہینہ ہے۔

قرآن، بندے کے اوپر اللہ کا انعام ہے اور روزہ بندے کی طرف سے اِس انعام کا عملی اعتراف۔

روزے کے ذریعے بندہ اپنے آپ کو تقوی اور اللہ کی شکرگزاری کے قابل بناتا ہے—

اور اِس طرح وہ اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ قرآن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق، دنیا میں خدا کی مطلوب زندگی گزار سکے۔

# عجز اور دعا

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عاجز انسان کی دعا قبول ہوتی ہے۔ یہ بات قرآن میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے: أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ (النمل: 62)۔ عاجز انسان خدا کی خصوصی نصرت کا مستحق بن جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ عاجز انسان کی دعا کی قبولیت کا راز کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اس وقت معلوم ہوتا ہے جب کہ عاجز انسان کی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے۔

جب ایک شخص عاجز (helpless) ہوجائے تو اس وقت اس کے اندر مخصوص کیفیات پیدا ہوتی ہیں، جو عام حالات میں کسی کے اندر پیدا نہیں ہوتیں۔ اس وقت اس کی داخلی روح (inner soul) آخری حد تک جاگ اٹھتی ہے۔ اس نفسیاتی حالت کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت آدمی کی زبان پر دعا کے جو کلمات جاری ہوجاتے ہیں، وہ عام قسم کے کلمات نہیں ہوتے، بلکہ وہ ایسے کلمات ہوتے ہیں جو اللہ کی رحمت کو انووک (invoke) کرنے والے ہوں۔ یہی خاص سبب ہے، جس کی بنا پر ایک عاجز انسان کی دعا اللہ کے یہاں قابل قبول قرار پاتی ہے۔

قرآن میں اس معاملے کی ایک مثال یہ ہے کہ قدیم مصر کے بادشاہ فرعون نے جب اپنی بیوی آسیہ کے قتل کا حکم دیا تو ان کی زبان سے یہ دعا نکلی: رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (التحریم: 11) یعنی اے میرے رب، میرے لئے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دے۔ یہ ایک بے حد خاص دعا ہے، جو آسیہ کی زبان سے اس وقت نکلی، جب ان کو محسوس ہوا کہ وہ بے بسی کی آخری حد تک پہنچ چکی ہیں۔ اس کامل بے بسی کی حالت میں ان کی روح کے اندر جو اعلیٰ ربانی کیفیت پیدا ہوئی، اُس نے اِس مخصوص دعا کی صورت اختیار کرلی۔ دعا بظاہر الفاظ کی صورت میں ہوتی ہے، لیکن دعا کا گہرا تعلق دعا کرنے والے کی کیفیت سے ہے۔ یہ دراصل کیفیت ہے جو کسی کی دعا کو اسم اعظم کی دعا بنا دیتی ہے، اور کیفیت حالات کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔

# ذکر کیا ہے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول کے بارے میں حضرت عائشہ کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے: كان النبي صلى الله عليه وسلم يذْكُر الله على كل أحيانه (صحیح البخاری، حدیث نمبر 305، صحیح مسلم، حدیث نمبر 373) یہ روایت اہل ایمان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کو بتاتی ہے۔ اہل ایمان کو ذہنی اعتبار سے ایک بیدار ذہن (awakened mind) بننا چاہئے۔ ان کی ربانی سوچ کو اتنی زیادہ ارتقا یافتہ ہونی چاہئے کہ ان کی زندگی کا ہر واقعہ یا ہر تجربہ ان کے لئے ذکر اور دعا کا پوائنٹ آف ریفرنس بن جائے۔

اس روایت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی دعا اور ذکر کے کچھ کلمات رٹ لے، اور ہر موقع پر ان کو زبان سے دہراتا رہے۔ یہ سنت رسول نہیں ہے۔ سنت رسول کے مطابق ذکر اور دعا ایک تکراری عمل نہیں ہے، بلکہ وہ ایک تخلیقی (creative) عمل ہے۔

دسمبر 2014 میں میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا، اس کی وجہ سے مجھ کو تقریباً دس دن بستر پر رہنا پڑا۔ اس مدت میں میں اپنی نمازوں کے لئے وضو نہ کرسکا، بلکہ تیمم کرکے نماز ادا کرتا رہا۔ اس معاملے پر غور کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ میری یہ نمازیں شاید ناقص نمازیں ہیں، میرا دل بھر آیا۔ اس وقت مجھے ایک عربی مقولہ یاد آیا: العذر عند كرام الناس مقبول (عذر کریم لوگوں کے لئے قابل قبول ہوتا ہے)۔ میں نے کہا کہ یا اللہ، تیرے کریم بندوں کے لئے جو عذر قابل قبول ہوتا ہے، وہ یقیناً تیرے لئے مزید اضافہ کے ساتھ قابل قبول ہوگا۔ اس وقت یہ جملہ میری زبان سے نکلا: العذر عند الله الكريم مقبول۔ یہ سوچ کر مجھے اللہ کی رحمت یاد آئی، میرا دل اطمینان سے بھر گیا، یہی ہے ہر موقع (occasion) پر اللہ کو یاد کرنا۔ ہر موقع پر اللہ کو یاد کرنا یہ ہے کہ آدمی ذہنی اعتبار سے اتنا بیدار ہو کہ ہر واقعہ اس کے لیے ایک ایسا پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) بن جائے، جس کے ذریعے وہ اپنے رب کو یاد کرے۔

# جنت کیا ہے

قرآن کی سورہ فصلت میں جنت کی صفت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ (41:31) یعنی فرشتے اہل جنت سے کہیں گے: اور تمھارے لیے وہاں ہر وہ چیز ہے جس کو تمھارا دل چاہے اور تمھارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کرو گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ہر اعتبار سے ایک کامل جگہ ہوگی۔ جنت میں کمی یا نقص کا کوئی پہلو موجود نہ ہوگا۔

قرآن کی اس آیت میں اہلِ جنت کی نسبت سے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں، ایک اشتہا اور دوسرا طلب۔ اشتہا کا لفظ عمومی انسانی خواہش کو بتاتا ہے، یعنی عمومی معنوں میں لوگ جن چیزوں کی خواہش رکھتے ہیں، وہ سب وہاں موجود ہوں گی۔

طلب کے لفظ میں انفرادی ذوق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی جنت میں وہ تمام چیزیں بھی ہوں گی، جو عمومی طور پر لوگوں کی پسند کی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ جنت میں ہر فرد کے ذاتی ذوق کی تکمیل کا سامان بھی موجود ہوگا۔

قرآن کے اس بیان میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے والے افراد تخلیقی ذہن (creative mind) رکھنے والے لوگ ہوں گے۔ عمومی پسند کے علاوہ ان میں سے ہر فرد کی اپنی ذاتی پسند بھی ہوگی۔ جنت میں اجتماعی پسند کا سامان بھی ہوگا، اور انفرادی پسند کا سامان بھی۔ جنت کی یہ صفت، جنت کی قیمت کو بہت زیادہ بڑھا دیتی ہے۔

گویا کہ جنت کا معاشرہ یکساں قسم کے درختوں کی مانند نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ متنوع قسم کے درختوں کے ایک باغ کی مانند ہوگا۔ جنت میں یکسانیت (uniformity) کے ساتھ تنوع (diversity) بھی ہوگا۔ جنت کی یہ صفت جنت کو بہت زیادہ خوبصورت اور بہت زیادہ با معنی بنا دے گی۔ جنت لذتوں کا مقام بھی ہوگا، اور تنوعات کا مقام بھی۔

# قرآن کا مطالعہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: من قرأحرفاًمن کتاب اللہ فلہ بہ حسنۃ، والحسنۃ بعشر امثالھا، لا أقول الم حرف، الف حرف ولام حرف ومیم حرف (الترمذي، حدیث نمبر: 2910) یعنی جس شخص نے اللہ کی کتاب میں سے ایک حرف پڑھا تو اس کے لیے اِس کے بدلے میں ایک نیکی ہے، اور ہر نیکی دس گنا تک بڑھتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔

یہ قولِ رسول ایک لمبی روایت میں بھی آیا ہے، اس میں یہ اضافہ ہے کہ إن ھذا القرآن مادبۃ اللہ تعالی فتعلموا من مأدبۃ اللہ ما استطعتم (مجمع الزوائد، حدیث نمبر: 11660) یعنی یہ قرآن ایک ربانی دسترخوان (banquet) ہے، پس تم اس دسترخوان سے سیکھو، جتنا تم سیکھ سکتے ہو۔

اس حدیث میں جو بات الفاظ کے اعتبار سے کہی گئی ہے، وہ دراصل معنی کے اعتبار سے مطلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں معانی کا خزانہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کا کوئی شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اسلوب انسان کی زبان میں عام ہے، یعنی کیفیاتی حقیقت (qualitative fact) کو کمیاتی زبان (quantitative language) میں بیان کیا گیا ہے۔

مذکورہ حدیث کی یہ شرح قرآن سے ثابت ہے۔ قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (38:29) یعنی یہ ایک برکت والی کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

قرآن کی یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ قرآن غور وفکر کی کتاب ہے۔ قرآن کا مدعا یہ نہیں ہے کہ لوگ اس کے الفاظ کو تلاوت کے طور پر دہرائیں، اور پراسرار طور پر اس کا ثواب ان کو ملتا رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تدبر کے بغیر قرآن کا مقصدِ نزول پورا نہیں ہوسکتا۔

# آل عمران، رکوع آخر

قرآن کی سورہ آل عمران کی آخری رکوع میں مومن کی تصویر بتائی گئی ہے۔اس رکوع میں کل گیارہ آیتیں ہیں۔ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔وہ کہہ اٹھتے ہیں اے ہمارے رب، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔تو پاک ہے، پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔اے ہمارے رب، تو نے جس کو آگ میں ڈالا، اس کو تو نے واقعی رسوا کر دیا۔اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، پس ہم ایمان لائے۔اے ہمارے رب، ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔اے ہمارے رب، تو نے جو وعدے اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے کئے ہیں، ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور وہ لڑے اور مارے گئے، میں ان کی خطائیں ضرور ان سے دور کر دوں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔یہ ان کا بدلہ ہے اللہ کے یہاں اور بہترین بدلہ اللہ ہی کے پاس ہے۔اور ملک کے اندر منکروں کی سرگرمیاں تم کو دھوکے میں نہ ڈالیں۔یہ تھوڑا فائدہ ہے۔پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے۔البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، ان کے لئے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔یہ اللہ کی طرف سے ان کی میزبانی ہوگی اور جو کچھ اللہ

کے پاس نیک لوگوں کے لئے ہے، وہی سب سے بہتر ہے۔ اور بے شک اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کتاب کو بھی مانتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب کو بھی مانتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی، وہ اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور وہ اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ اے ایمان والو، صبر کرو اور صبر پر قائم رہو اور باہم مربوط رہو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم کامیاب ہوگے۔

آیات 192-190 — ان آیتوں میں مومن کی فکری زندگی کو بتایا گیا ہے۔ وہ صبح وشام، رات دن تخلیقِ خداوندی پر غور کرتا ہے۔ اس مسلسل غور وفکر سے اس کو زندگی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے، خدایا، مجھے آخرت کی ابدی دنیا میں ناکامی سے بچا۔

آیات 194-193 — تخلیقِ خداوندی میں غور وفکر کے نتیجہ میں وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ داعی حق کی بات کو کامل سنجیدگی کے ساتھ سنے۔ وہ تعصب کے تمام پردوں کو پھاڑ کر اس کو پہچان لے۔ وہ کسی تحفظ ذہنی کے بغیر داعی حق کی پکار پر، اس امید کے ساتھ لبیک کہتا ہے کہ اس کا ایسا کرنا اس کو اللہ کی نصرت کا مستحق بنائے گا۔

آیت 195 — یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ کے نزدیک فکری سطح پر اس کا اعتراف کافی نہیں۔ اللہ کے نزدیک ضروری ہے کہ آدمی کا فکری اعتراف عمل کی سطح پر ظاہر ہو، وہ اس کی عملی زندگی میں ڈھل جائے۔

اس کے بعد چار عملی کردار کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہجرت، اخراجِ وطن، اللہ کے راستے میں ایذاء، اور قتال۔ یہ چار باتیں اپنی شکل کے اعتبار سے مطلق نہیں ہیں، البتہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ مطلق ہیں، اور ہر زمانے کے اہل ایمان سے یکساں طور پر مطلوب ہیں۔ رسول کے معاصر اہل ایمان کے لیے اس کا اظہار ان چار صورتوں میں ہوا ہے۔

بعد کے زمانے میں حالات کی نسبت سے ان کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ تاہم ان کی اصل حقیقت قربانی (sacrifice) ہے، اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ہمیشہ مطلوب رہے گی۔ جو ایمان

قربانی کے بغیر ہو، وہ ایمان اللہ کے نزدیک مطلوب ایمان نہیں ہے۔ چوں کہ پیغمبر کے معاصر اہل ایمان کے ساتھ یہ چاروں قسم کے تجربات پیش آئے۔ مگر بعد کے اہل ایمان کے لیے زمانے کے اعتبار سے اس کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ ان چاروں چیزوں کی اصل حقیقت قربانی کی سطح پر اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہے۔ بعد کے زمانے کے اہل ایمان کے لیے بھی یہ شرط موجود رہے گی۔ البتہ حالات کے اعتبار سے اس کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

آیات 198-196 — اس کے بعد انسانوں کے لیے دو مختلف قسم کے انجام کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو لوگ خدا سے سرکشی کا طریقہ اختیار کریں، ان کے لیے آخرت میں سخت پکڑ ہوگی۔ اس کے برعکس، جو لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ اختیار کریں وہ آخرت کی ابدی دنیا میں جنت کے باغوں میں جگہ پائیں گے۔

آیت 199 — اس آیت میں اہل ایمان کی اس صفت کا ذکر ہے کہ وہ تعصب سے کامل طور پر خالی ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔ وہ ہر رسول پر یکساں طور پر ایمان رکھتے ہیں۔ کوئی دنیوی مصلحت ان کو سچائی کے راستے سے ہٹانے والی نہیں۔

آیت 200 — اس آیت میں صبر واستقامت کی تاکید کی گئی ہے۔ ایمان کے راستے پر چلنے کے بعد ایسے مواقع بار بار آتے ہیں، جو آدمی کو متزلزل کر سکتے ہیں اور اس کو شبہ میں ڈال سکتے ہیں۔ اس طرح کے مواقع پر آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی فکر کو پھر سے بیدار کرے۔ وہ غور وفکر کے ذریعے اپنے آپ کو یقین پر قائم رکھے۔ اس طرح اس کے اندر صبر واستقامت آئے گی۔ وہ دوسرے اہل ایمان کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ بندھا رہے گا۔ اگر کوئی ناپسندیدہ بات پیش آئے گی تو وہ اس کو اپنی ذہنی بیداری کے ذریعے اپنے لیے غیر موثر بنا دے گا۔

آخر میں فرمایا اتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ یہ تمام باتوں کا خلاصہ ہے۔ مذکورہ تمام افعال صرف اس وقت مطلوب صورت میں انجام دیے جاسکتے ہیں، جب کہ ان کے پیچھے تقوی کی اسپرٹ موجود ہو۔ یہ صرف تقوی ہے جو کسی انسان کی حقیقی فلاح کا ضامن ہے۔ تقوی کے بغیر فلاح کا حصول ممکن نہیں۔

# موت کا ذکر کثیر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اکثروا ذکر هادم اللذات، يعني الموت (ابن ماجه، حدیث نمبر: 4258) یعنی موت کو بہت زیادہ یاد کرو، جو لذتوں کو ڈھادینے والی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کی یاد آدمی کے اندر دنیارخی سوچ کو منہدم کردیتی ہے اور اُس کے اندر آخرت رخی سوچ پیدا کردیتی ہے۔ اگر آدمی بار بار موت کو یاد کرے، تو اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا پسند انسان کے بجائے آخرت پسند انسان بن جائے گا۔

اِس حدیث میں لذت کا لفظ اُن تمام چیزوں کے لیے ہے جو آدمی کے لیے کسی چیز کو مرکز توجہ بناتی ہے۔ اِس لحاظ سے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اِس حقیقت کو بہت زیادہ یاد کرے کہ وہ اِس دنیا میں ہمیشہ نہیں رہے گا بلکہ سو سال سے بھی کم مدت میں مرجائے گا تو اُس کا مرکز توجہ بدل جائے گا۔ وہ اُس دنیا کو زیادہ سے زیادہ اہم سمجھے گا جو موت کے بعد آنے والی ہے، نہ کہ اُس دنیا کو جس میں موت سے پہلے عارضی طور پر زندگی گزار رہا ہے۔

یہ طرز فکر آدمی کے اندر ایک انقلاب پیدا کردے گا۔ اُس کی سوچ بدل جائے گی، اُس کا سلوک بدل جائے گا، اُس کے لین دین کا طریقہ بدل جائے گا، اُس کی اخلاقی روش بدل جائے گی، اُس کے روز وشب بدل جائیں گے۔ یہی مطلب ہے لذتوں کو ڈھانے کا۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی یاد آدمی کے اندازِ فکر کو پوری طرح بدل دیتی ہے۔ جس چیز کو آج کل ''یہیں اور ابھی'' (right here, right now) کہا جاتا ہے، وہ صرف اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ انسان موت سے غافل ہو۔ اگر اُس کو موت کی حقیقت کا زندہ شعور ہوجائے تو وہ کبھی اِس قسم کا فارمولا نہ اپنائے۔ موت کے ہادم اللذات ہونے کا مطلب یہ ہے کہ موت آدمی کی زندگی کے رخ کو مکمل طور پر بدل دیتی ہے۔

# زوال کی علامت

عمرو بن میمون التابعی (وفات: 74ھ) نے صحابہ کے بارے میں کہا: کان أصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم أسرع الناس إفطارا وأبطأہ سحورا (مصنف عبد الرزاق: 7591)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب افطار میں بہت جلدی کرنے والے لوگ تھے، اور وہ سحری میں بہت دیر کرنے والے لوگ تھے۔

تابعی کے اس قول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحابہ وقت سے پہلے افطار کر لیتے تھے، یا وہ سحری میں وقت ختم ہونے کے بعد بھی کھاتے رہتے تھے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ صحابہ تکلف سے بَری تھے۔ ان کے اندر زندہ دین داری تھی، نہ کہ روایتی دین داری۔ روایتی دین داری کا مزاج ظواہر میں احتیاط اور مبالغہ کا مزاج ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، جن لوگوں کے اندر زندہ دین داری ہو، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اسپرٹ کو اصل سمجھا جائے، نہ کہ فارم کو۔ چناں چہ وہ وقت آتے ہی فوراً افطار کر لیتے ہیں، وہ احتیاط کے نام پر پانچ منٹ کا اضافہ نہیں کرتے۔ ان کا یہی حال سحری اور دوسرے معاملات میں بھی ہوتا ہے۔

امت پر جب زوال آتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے افراد دین کو مکمل طور پر چھوڑ دیں۔ دورِ زوال میں جو بات ہوتی ہے وہ یہ کہ امت کے افراد میں دین کی اسپرٹ ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ دین کے نام پر کچھ ظواہر باقی رہتے ہیں۔ دین کی حقیقت موجود نہیں ہوتی لیکن دین کا فارم (form) ان کے یہاں موجود رہتا ہے۔

انسان کی نفسیات یہ ہے کہ وہ جس چیز کو اہم سمجھے اس میں زیادہ سے زیادہ اعتناء کرے۔ جب امت زندہ ہوتی ہے تو اس کے افراد دین کی اسپرٹ کے معاملے میں زیادہ اہتمام کرتے ہیں، وہ ہر وقت سوچتے رہتے ہیں کہ ان کی دینی اسپرٹ میں کمی تو نہیں ہو گئی، اگر وہ اپنی زندگی میں کوئی ایسی چیز دیکھتے ہیں، جو اسپرٹ کے مطابق نہ ہو تو اس پر وہ تڑپ اٹھتے ہیں، اور فوراً اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس دورِ زوال میں یہ حال ہوتا ہے کہ امت کے افراد ظواہر میں زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنے لگتے ہیں۔

# ایک انقلابی اصول

قرآن میں کلمۂ سوا (3:64) کا اصول بتایا گیا ہے۔ کلمۂ سوا کا مطلب ہے اپنے اور مخاطب کے درمیان مشترک بنیاد (common ground) تلاش کر کے اپنی بات کہنا تاکہ مخاطب کسی اجنبیت کے بغیر آپ کی بات سن سکے۔ کلمۂ سوا کا یہ اصول کسی محدود معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ نہایت وسیع معنی میں ہے۔

موجودہ زمانے میں کلمۂ سوا کے اصول کا انطباقی امکان (applicable scopes) بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اس کا خاص سبب موجودہ زمانے میں اوپین نیس کا مزاج (spirit of openness) ہے۔ آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ آپ لائبریری کلچر کو استعمال کر کے ہر جگہ اپنے لٹریچر کو مطالعے کی میز پر پہنچا دیں، بک فیر کے رواج کو استعمال کر کے اپنی مطبوعات کو ہر شہر اور ہر ٹاؤن میں پہنچا دیں، سیمینار اور کانفرنس میں شرکت کر کے ہر طبقے کے لوگوں تک اپنی پہنچ بڑھا دیں، سیاحت کلچر کو استعمال کر کے اپنی بات کو عالمی دائرے میں پھیلا دیں، تعلیمی اداروں کو استعمال کر کے نوجوانوں کو اپنے مقصد کے مطابق تربیت دیں، بڑے بڑے اخبارات اور ٹی وی کے نیٹ ورک کو اپنے خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنالیں، وغیرہ۔

مگر ان جدید مواقع کو استعمال کرنے کی ایک لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ آپ اپنے اور جدید ذہن کے درمیان کلمۂ سوا کو دریافت کریں، اور پھر دانش مندانہ انداز میں اس کو استعمال کریں۔ جدید ذہن کی خاص صفت بے تعصبی ہے۔ جدید ذہن کے نزدیک طبقاتی سوچ (sectarian thinking) شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جدید ذہن کے مطابق موضوعی فکر (objective thinking) کی حیثیت معیاری فکر کی ہے۔ جدید ذہن امن پسند ذہن ہے، وہ نفرت اور تشدد کو ہر حال میں برا سمجھتا ہے۔

# دیکھیں صبح کیسے ہوتی ہے

کہا جاتا ہے کہ ایک بوڑھی عورت ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ اس کے یہاں ایک مرغا تھا جو اپنی عادت کے مطابق صبح کو بانگ دیتا تھا۔ بوڑھی عورت یہ سمجھتی تھی کہ گاؤں میں اس کے مرغ کی بانگ سے صبح ہوتی ہے۔ ایک بار وہ گاؤں والوں سے کسی بات پر غصہ ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے اپنے مرغ کو لیا اور یہ کہتی ہوئی گاؤں سے نکل گئی کہ — اب دیکھیں یہاں کیسے صبح ہوتی ہے۔

بظاہر یہ ایک کہانی ہے لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ انسانوں کے عام مزاج کے مطابق ہے۔ یہ مزاج اتنا عام ہے کہ شاید کسی بھی شخص کا اس میں استثنا (exception) نہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کا واقعہ ہے، آپ کے چچا ابو طالب آپ پر ایمان نہیں لائے تھے مگر خاندانی تعلق کی بنا پر وہ آپ کا ساتھ دیتے تھے۔ آخر عمر میں کہا جانے لگا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے آمادہ ہوگئے ہیں۔ یہ سن کر قریش کے سردار ابو طالب کے گھر پر جمع ہوئے اور ان کو عار دلایا کہ کیا آپ اپنے باپ عبد المطلب کے دین کو چھوڑ دیں گے۔ اِس طرح انھوں نے ابو طالب کو رسول اللہ پر ایمان لانے سے روک دیا۔ قریش کے سردار اپنے اس کارنامے کے بعد جب ابو طالب کے گھر سے واپس ہوئے تو ان کی نفسیات یہ تھی — اب دیکھیں محمد کا مشن کیسے جاری رہتا ہے۔ مگر تاریخ جانتی ہے کہ قریش کے سرداروں کا خیال کتنا زیادہ بے بنیاد ثابت ہوا۔

اس طرح کے واقعات تاریخ میں بار بار پیش آئے ہیں اور اب بھی پیش آرہے ہیں۔ مگر اس قسم کے نادان لوگوں نے تاریخ کے تجربات سے کوئی سبق نہیں لیا۔ وہ اب بھی اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ کوئی مشن اپنی داخلی طاقت (inner strength) کے زور پر چلتا ہے نہ کہ کسی انسان کے ساتھ دینے یا ساتھ نہ دینے پر۔ اس دنیا کو بنانے والے نے دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں نہ کسی کی موافقت سے کسی کا کام بنتا ہے، اور نہ کسی کی مخالفت سے کوئی کام بگڑتا ہے، جو کچھ ہوتا ہے وہ خالق کے مقرر منصوبے کے مطابق ہوتا ہے۔ موافقت یا مخالفت دونوں صرف ظاہری اسباب ہیں۔

# مسِّ مصحف کے لیے وضو کی شرط

کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ قرآن ایک مقدس کتاب ہے۔ اس کو چھونے سے پہلے وضو کرنا ضروری ہے۔ وضو کے بغیر قرآن کو چھونا جائز نہیں۔ قرآن کو چھونے یا اس کو ہاتھ میں لے کر پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی وضو کر کے اپنے آپ کو پاک کر چکا ہو۔ لیکن یہ شرط بعد کے زمانے کی پیداوار ہے۔ دورِ اول میں یا قرآن اور حدیث میں نصّاً اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں، وہ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں، قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:
لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (56:79) یعنی قرآن کو نہیں چھوتے، مگر وہ لوگ جو کہ مطہَّر ہیں۔

قرآن کی اس آیت کا تعلق مذکورہ مسئلے سے نہیں ہے۔ اس آیت میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے، جس سے یہ معلوم ہو کہ مصحف کو چھونے کے لیے باوضو ہونا ضروری ہے۔ قرآن کی اس آیت میں مطہَّر یا پاکیزہ (purified) سے مراد فرشتے ہیں۔ یعنی اس میں اس واقعے کا ذکر ہے، جس کا تعلق فرشتوں سے ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی اس آیت میں جس مَسّ کا ذکر ہے اس سے مراد مسِّ مادی نہیں ہے، بلکہ مسِّ معنوی ہے۔

اس آیت کا سیاق بتاتا ہے کہ یہاں اُن فرشتوں کا ذکر ہے، جو قرآن کی وحی لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترتے تھے، اور آپ کو قرآن پہنچاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے جس قرآن کی تنزیل کا ذریعہ بنتے تھے، وہ قرآن باعتبار معنی ہوتا تھا نہ کہ قرآن باعتبار مصحف۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو چھونے کے لیے باوضو ہونے کی بحث کی بنا پر آیت کا اصل مقصود اوجھل ہو گیا ہے۔ اس آیت میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن ایک عظیم کلام ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب ہے جو اعلیٰ معانی پر مشتمل ہے، وہ رب العالمین کے خصوصی اہتمام کے تحت پیغمبر آخر الزماں پر اتارا گیا ہے۔ انسان اگر اس کے معانی کی عظمت پر غور کرے تو وہ یہ ماننے پر مجبور ہو جائے گا کہ یہ اللہ کا کلام ہے نہ کہ کسی انسان کا کلام۔

# اجتہاد یا فتویٰ

امام ابوحنیفہ (وفات 150 ھ) کے پاس ایک شخص آیا اور کہا، میں نے قسم کھائی ہے کہ میں اپنی بیوی سے کلام نہ کروں گا یہاں تک کہ وہ مجھ سے کلام کرے، اور میری بیوی نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ مجھ سے بات نہ کرے گی، یہاں تک کہ میں اس سے بات کروں۔ امام صاحب نے جواب دیا تم دونوں میں سے کوئی بھی حانث نہیں۔

سفیان ثوری (وفات: 161 ھ) نے جب یہ جواب سنا تو ناراضگی کا اظہار فرمایا اور امام اعظم کے پاس پہنچے اور کہا آپ نے یہ جواب کیسے دے دیا۔ امام ابوابوحنیفہ نے فرمایا کہ مرد کے قسم کھانے کے بعد جب عورت نے مرد سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں تم سے بات نہ کروں گی جب تک کہ تم مجھ سے بات نہ کرو تو مرد کی قسم تمام ہوگئی، اور مرد اس سے بات کرے گا تو حانث نہ ہوگا، اور مرد جب اس سے بات کرلے گا تو عورت کی قسم تمام ہو جائے گی، پھر عورت بھی حانث نہ ہوگی۔

امام ابوحنیفہ (اور دوسرے ائمہ فقہ) کی اس قسم کی باتوں کو اجتہاد سمجھا جاتا ہے۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ جزئی مسائل میں فتوی دینے کا واقعہ ہے۔ اجتہاد زیادہ بڑے بڑے شرعی امور میں دین کا موقف بتانے کا نام ہے، نہ کہ جزئی نوعیت کے مسائل میں فقہی مسئلہ بتانے کا نام۔

اس قسم کے جزئی امور پر فتوی دینے والوں کو مجتہد بلکہ مجتہد مطلق سمجھ لیا گیا۔ یہ بلاشبہہ اجتہاد کا کمتر اندازہ (underestimation) تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس نے امت سے حقیقی اجتہاد کا خاتمہ کر دیا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ بعد کے زمانے میں اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ اجتہاد کے غلط تصور کی بنا پر اجتہاد کا ذہن ختم ہوگیا، اسی کوتاہی کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں بڑے بڑے مسائل پیش آئے جو اجتہاد کا تقاضا کرتے تھے لیکن علماء اس سے عاجز ثابت ہوئے کہ وہ ان امور میں اجتہاد کر کے امت کو صحیح رہنمائی دیں۔

# فطرت کا نظام

قرآن کی سورہ التوبہ میں ایک واقعہ کے ریفرنس میں فطرت کا ایک قانون (9:36) بتایا گیا ہے۔ خالق کو یہ مطلوب ہے کہ یہ قانون تاریخ میں مسلسل طور پر قائم رہے، تاکہ تخلیق کا مقصد پورا ہونے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ چوں کہ انسان کو آزادی دی گئی ہے، اس لئے انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرکے کبھی اس نظام میں خلل پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت انسانی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اللہ مداخلت کرکے اس رکاوٹ کو درست کرتا ہے، تاکہ فطرت کا نظام اپنے مطلوب تخلیقی نقشے پر چلتا رہے۔

اس معاملے کی ایک جزئی مثال قدیم عرب میں نَسی (intercalation) کا واقعہ ہے۔ تخلیقی نظام کے مطابق قمری کیلنڈر (lunar calendar) اور شمسی کیلنڈر (solar calendar) کے درمیان ایک سال میں تقریباً بارہ دن کا فرق ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں عربوں نے نَسی کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ خودساختہ طور پر ہر سال ایسا کرتے تھے کہ قمری کیلنڈر کے دنوں میں اضافہ کرکے اس کو شمسی کیلنڈر کے مطابق کر لیتے تھے۔

یہ طریقہ تخلیقی نظام میں مداخلت کی حیثیت رکھتا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں جو اصلاحات کیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ آپ نے فتح مکہ (8ھ) کے بعد ایک حکم کے تحت اس طریقے کو ختم کر دیا، اور قمری کیلنڈر کو اس کے فطری نقشے پر قائم کر دیا۔ حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو، خطبۂ حجۃ الوداع، صحیح البخاری، حدیث نمبر: 3197، صحیح مسلم، حدیث نمبر: 1679۔

اس طرح کے اصلاحی معاملہ کی زیادہ بڑی مثال وہ ہے جس کا ذکر قرآن کی سورہ الانفال میں ان الفاظ میں آیا ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (8:39) یعنی اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لئے ہو جائے۔

قرآن کی اِس آیت میں فتنہ سے مراد مذہبی تشدد (religious persecution) ہے۔ قدیم زمانے میں ساری دنیا میں مذہبی انتہا پسندی (religious extremism) کا طریقہ رائج تھا۔

مزید یہ کہ اس مذہبی انتہا پسندی کو پولٹسائز (politicize) کرکے، اس کے حق میں وقت کے حکمرانوں کی حمایت بھی حاصل کرلی گئی تھی، اس کے نتیجے میں مذہبی انتہا پسندی نے عملاً مذہبی تشدد (religious persecution) کی صورت اختیار کرلی تھی۔

یہ صورت حال خدا کے قائم کردہ تخلیقی نقشے کے خلاف تھی۔ اللہ کو یہ مطلوب تھا کہ مذہب کے معاملے میں تشدد کا طریقہ ختم ہو، اس کے بجائے پورے معنوں میں مذہبی آزادی (religious freedom) کا طریقہ رائج ہوجائے۔ تاکہ ہر شخص آزادانہ طور پر اپنے عقیدہ کے مطابق عمل کرسکے۔

مذہبی جبر کے خاتمہ کا یہ عمل رسول اور اصحاب رسول کے زمانے میں شروع ہوا۔ تدریجی عمل (gradual process) کے تحت وہ تاریخ میں سفر کرتا رہا۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے یہ عمل یورپ میں پہنچا۔ اہل یوروپ نے اس میں مزید اضافے کئے۔ یہاں تک کہ مذہبی آزادی کا مطلوب نظام اپنی آخری صورت میں قائم ہوگیا۔ دنیا میں مذہبی آزادی کا دور لانے کے معاملے میں اہلِ یوروپ کا رول تکمیلی رول کی حیثیت رکھتا ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تاریخ کے اس واقعے کو سمجھیں، وہ اہلِ مغرب کے خلاف اپنے منفی ذہن (negative thinking) کو مکمل طور پر ختم کردیں، اس معاملے میں وہ اہلِ مغرب کے کنٹری بیوشن کا اعتراف کریں، وہ اہلِ مغرب سے رقابت کا تعلق ختم کردیں، اور اس کے بجائے دوستی کا طریقہ اختیار کریں، وہ اس معاملے میں اہلِ مغرب کو اپنا محسن سمجھیں۔

مسلمانوں کے درمیان جب اس قسم کا مثبت ذہن پیدا ہوگا تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے اندر سے منفی ذہن کا مکمل خاتمہ ہوجائے گا، اور دعوت الی اللہ کا فریضہ بخوبی طور پر انجام پانے لگے گا۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی قومی شکایتوں کو مکمل طور پر ختم کردیں۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ مسلمان خدا کے قائم کردہ فطری نظام کو سمجھیں، اور پیدا شدہ مواقع کو استعمال کریں۔

# حمد اور کبد کے درمیان

قرآن میں ایک طرف حمد خداوندی کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق دنیا انسان کے لیے کبد (90:4) کی دنیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسائل کے درمیان رہتے ہوئے خدا کا شکر کرنے والے بنو۔ ناپسندیدہ حالات میں بھی تمہارا دل شکر الٰہی کے مثبت جذبات سے معمور رہے۔ حمد اللہ کی نسبت سے مطلوب ہے، اور صبر انسان کی نسبت سے۔

قرآن کے اس بیان کے مطابق، دنیا انسان کے لیے دار الکبد ہے۔ ایسی حالت میں، وہ کس طرح سچا شکر گزار بن کر رہ سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ حمد اللہ کی نسبت سے ہے، اور کبد انسان کی نسبت سے۔ انسان سے اصل چیز جو مطلوب ہے، وہ حمد اور شکر ہے۔ دار الکبد میں انسان شکر گزار کیسے بنے۔ اس کا جواب صبر ہے۔ مومن کو انسان کی زیادتیوں پر صبر کرنا ہے تاکہ اس کے اندر شکر کی اسپرٹ باقی رہے، وہ ہر حال میں اپنے رب کے لیے شکر کا رسپانس دیتا رہے۔ دوسروں کے مقابلے میں صبر کرنا کوئی منفی بات نہیں۔ اس میں خود انسان کی اپنی بھلائی چھپی ہوئی ہے۔

جو شخص انسان کی زیادتیوں پر صبر کرے گا اس کے اندر ذہنی انضباط (intellectual discipline) کی صلاحیت پرورش پائے گی۔ اس کے اندر ذہنی بیداری آئے گی۔ وہ ایک سنجیدہ انسان بن جائے گا۔ اس کی فطرت میں چھپے ہوئے امکانات (potential) اَن فولڈ (unfold) ہونے لگیں گے۔ اس کے اندر گہری سوچ (deep thinking) پیدا ہوگی۔ اس طرح وہ اس قابل ہوجائے گا کہ اعلیٰ معرفت کی سطح پر جینے لگے۔ وہ ایک دانش مند انسان (man of wisdom) بن جائے گا۔

انسان کو چاہئے کہ وہ دنیا کے کبد (مسائل) پر ری ایکٹ (react) کرنے کے بجائے ان کے بارے میں آرٹ آف منیجمنٹ سیکھے۔ یہی وہ واحد قیمت ہے جس کو ادا کرکے انسان اس قابل ہوسکتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنے خالق کی مرضی کے مطابق رہے، اور آخرت میں جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے۔

# انسان کا امتحان

قرآن میں انسان کی تخلیق کے بارے میں بتایا گیا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (95:4-5)۔ انسان کو احسنِ تقویم کے ساتھ پیدا کیا جانا اور پھر اس کو اسفلِ سافلین میں ڈال دینا، کوئی سزا کی بات نہیں۔ یہ انسان کے بارے میں نظامِ تخلیق کی بات ہے۔ انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے لامحدود خواہشات کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن عملاً جس دنیا میں وہ زندگی گزارتا ہے، وہاں خواہشات کی صرف محدود تکمیل ممکن ہے۔ انسان اپنی پوری عمر انھی دو مختلف تقاضوں کے درمیان زندگی گزارتا ہے:

Life is a perpetual conflict between wanting more and receiving less.

انسان کے ساتھ یہ معاملہ اس کی اپنی بھلائی کے لئے کیا گیا ہے۔ اس صورت حال کے نتیجہ میں انسان کے اندر ذہنی کش مکش (intellectual struggle) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ انسان کی ترقی کے لئے بے حد اہم ہے۔ اس ذہنی کش مکش کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان ذہنی جمود (intellectual stagnation) سے بچ جاتا ہے۔ انسان کے اندر مسلسل طور پر ذہنی ارتقا (intellectual development) کا عمل جاری رہتا ہے۔ انسان کی ذہنی بیداری کا سفر کسی مقام پر نہیں رکتا۔ اس اعتبار سے یہ حالت ایک عظیم رحمت کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) پیدا ہو۔ یہ انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ یہ صفت کبھی ہموار حالات میں پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ انسان عدم تشفی (dissatisfaction) کی صورت حال سے دوچار ہو۔ یہی وہ چیز ہے جو کسی انسان کو تخلیقی انسان بناتی ہے۔

اس معاملے کو قرآن میں انسان کا ابتلاء (test) کہا گیا ہے۔ یہ ابتلاء کسی منفی معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ کامل طور پر مثبت معنی میں ہے۔ وہ انسان کی بہتری کے لیے ہے۔ انسان اگر اس حقیقت کو جانے تو وہ ابتلاء کی صورت حال کا مثبت ذہن کے ساتھ استقبال کرے گا۔

# شیطان سے حفاظت

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ مسند احمد کے الفاظ یہ ہیں: یا عمر فو الله، إن لقيك الشيطان بفج قط، إلا أخذ فجا غير فجك (مسند احمد، حدیث نمبر: 1624) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر، خدا کی قسم، جب بھی شیطان تم سے کسی راستہ میں ملتا ہے، تو وہ تمھارے راستے کے بجائے دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، وہ کوئی پراسرار (mysterious) بات نہیں ہے، اور نہ وہ ایک شخص کی فضیلت کے معنی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر اس شخص کی بات ہے، جس کو شعوری ایمان حاصل ہو۔ یہ وہی ایمانی تجربہ ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰۗىِٕفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (7:201) یعنی جو لوگ ڈر رکھتے ہیں جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے، تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں، اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آ جاتی ہے۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق شیطان سے بچنے کا اصل راز تذکر ہے۔ تذکر کا مطلب ہے یاد کرنا (to remember)۔ مگر یہ یاد، سادہ طور پر صرف یاد کے معنی میں نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اتنا زیادہ باشعور ہو کہ جب شیطان اس کے دل میں کوئی وسوسہ ڈالے، تو وہ فوراً اس کا تجزیہ (analysis) کر کے، اس کو بے اثر بنا دے۔ حضرت عمر اپنی ذہنی بیداری کی بنا پر یہی کام کرتے تھے۔ دوسرے وہ تمام اہل ایمان بھی یہی کام کریں گے، جن کے اندر ذہنی ارتقا کے نتیجہ میں تجزیہ کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہو۔ مثلاً اس نوعیت کا ایک واقعہ یہ ہے۔ حضرت عمر خلیفہ کی حیثیت سے مدینہ میں اپنے مقام پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک شخص (عیینہ بن الحصن) آیا۔ اس نے کہا: یا ابن الخطاب، فو الله ما تعطينا الجزل ولا تحكم بيننا بالعدل۔ یعنی اے ابن خطاب، تم ہم کو نہ کچھ دیتے ہو، اور نہ ہمارے درمیان انصاف کرتے ہو۔ یہ سن کر حضرت عمر کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے اس کا

قصد کیا (تاکہ اس کو سزا دے)۔ اس وقت حر بن قیس نے کہا، اے امیر المومنین، اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ نادان سے اعراض کرو (7:199) اور یہ بلا شبہہ ایک نادان شخص ہے۔ یہ سن کر عمر رک گئے، اور انھوں نے عیینہ کے خلاف کچھ نہیں کیا (صحیح البخاری:4642)

حضرت عمر قرآن کی مذکورہ آیت سن کر کیوں رک گئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے ذہن نے معاملہ پر از سر نو غور کیا۔ پہلے وہ عیینہ کو ایک غلط انسان سمجھ کر، اس کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ اب انھوں نے از سرِ نو غور کیا، تو ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ ایک نادان آدمی ہے، اور اس قابل ہے کہ اس سے اعراض کا معاملہ کیا جائے۔

اس طرح کے معاملات دوسرے صحابہ اور تابعین کے بارے میں بھی کثرت سے کتابوں میں موجود ہیں۔ مثلاً ابوذر اور بلال دونوں صحابی تھے۔ ابوذر کو کسی بات پر بلال پر غصہ آ گیا۔ ان کی زبان سے نکلا، یا ابن السوداء (اے سیاہ فام ماں کے بیٹے)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا: یا أباذر، إنك إمرء فيك جاهلية (اے ابوذر، تمھارے اندر ابھی تک جاہلیت کا اثر موجود ہے)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ تمھارے بھائی (اخوان) ہیں۔ یہ سن کر حضرت ابوذر کے اندر ندامت پیدا ہوئی۔ ان کو محسوس ہوا کہ میں اس معاملہ کو سیاہ فام اور سفید فام کا معاملہ سمجھتا تھا۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ انسان کا معاملہ ہے۔ اور انسان کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔ پہلے اگر شیطان نے ان پر حملہ کیا تھا تو اب تذکر کے نتیجہ میں وہ شیطان کے اثر سے باہر آ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی، وہ عمر کی فضیلت کے طور پر نہ تھی، بلکہ آپ نے ایک شخص کے حوالے سے ایک اصولی بات بتائی۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں ہر انسان شیطانی حملوں کی زد میں ہے۔ ہر انسان شیطانی وسوسہ کا شکار ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ آدمی کا ایمانی شعور اتنا زیادہ بیدار ہو کہ جب بھی شیطان اس کے دل میں کوئی برا خیال ڈالے، تو وہ فوراً اس کا تجزیہ کر کے اپنے آپ کو اس کے اثر سے بچا لے۔ مذکورہ حدیث میں راستہ بدلنے کی جو بات کہی گئی ہے، وہ انسان کی نسبت سے ہے، نہ کہ شیطان کی نسبت سے۔

# تیار ذہن کی اہمیت

کہا جاتا ہے کہ سائنس میں جو دریافتیں ہوئی ہیں، وہ زیادہ تر اتفاقات کا نتیجہ ہیں۔ ریسرچ کے دوران کوئی اتفاقی واقعہ پیش آتا ہے، اس سے ایک سائنس داں کا ذہن ایک امکان کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اور پھر اس پر مزید کام کرکے سائنس داں ایک حقیقت تک پہنچتا ہے:

The role of chance in science, or luck in science, describes the ways that unexpected discoveries are made. Somewhere between 30% and 50% of all scientific discoveries are in some sense accidental.

Louis Pasteur said: “Luck favours the prepared mind”.

یہ بات جس طرح سائنس کے لیے درست ہے، اُسی طرح وہ دوسری دریافتوں کے لیے بھی درست ہے۔ مذہب میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے کہ ایک آدمی، جب اپنے آپ کو مطالعہ اور تدبر کے ذریعہ تیار کرتا ہے تو وہ اِس قابل ہوجاتا ہے کہ کسی بات کے ظاہری معنی کے ساتھ اُس کے اندر چھپی ہوئی حکمت کو بھی جان لے۔ اس معاملہ کو قرآن میں توسم کہا گیا ہے۔ ایسا آدمی اِس قابل ہوتا ہے کہ وہ معمولی باتوں سے غیر معمولی نتیجہ اخذ کرسکے۔

اصل اہمیت یہ ہے کہ انسان مطالعہ اور مشاہدہ اور غور وفکر کے ذریعہ اپنے آپ کو ایک تیار ذہن بنائے۔ وہ اپنے اندر اخذ واستنباط کی صلاحیت پیدا کرے۔ وہ اپنی تفکیری صلاحیت کو مسلسل ترقی دیتا رہے۔ جو انسان ایسا کرے، وہ ایک تیار ذہن ہے۔ ایسے انسان کا دماغ، مقناطیس کی مانند ہوجائے گا۔ جب بھی کوئی ذرۂ معرفت اُس کے سامنے آئے گا، وہ فوراً اُس کو اخذ کرلے گا۔ یہی وہ انسان ہے، جس کو قرآن میں عارف انسان کہا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو مطالعہ اور غور وفکر کے ذریعے ایک تیار ذہن بنا رکھا ہو۔ جب ایسا ہوگا تو وہ معلوم کے درمیان نامعلوم کو جان لے گا، وہ ظاہر کے درمیان مخفی حقیقت کو دریافت کرلے گا۔

# دو چہرے والا شخص

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن شر الناس ذو الوجهين الذي يأتي هؤلاء بوجهٍ، وهؤلاء بوجهٍ (صحيح البخاري، حديث نمبر: 7179) یعنی لوگوں میں سب سے برا شخص وہ ہے جو دو چہرے والا ہو، وہ کچھ لوگوں سے ایک چہرہ کے ساتھ ملے اور کچھ سے دوسرے چہرے کے ساتھ۔

یہ وہی کردار ہے، جس کو دوہرا معیار (double standard) کہا جاتا ہے۔کوئی انسان ایسا رویہ کیوں اختیار کرتا ہے۔ اِس کا سبب مفاد پرستی ہے۔ایسے شخص کا اصل کنسرن (concern) یہ ہوتا ہے کہ اس کا مادی مفاد مجروح نہ ہونے پائے۔وہ ہر ایک سے فائدہ حاصل کر سکے۔اس مقصد کے لیے وہ یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ اس طرح بات کرے کہ ہر ایک اُس کو اچھا سمجھے۔کسی سے اُس کا بگاڑ نہ ہونے پائے۔یہی مزاج اُس آدمی کو دوہرا معیار والا شخص بنا دیتا ہے۔

اِس قسم کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد اُس کو یہ وقتی فائدہ تو حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک کی نظر میں اچھا انسان بن جاتا ہے، لیکن اِس طریقہ کا شدید تر نقصان یہ ہوتا ہے کہ اُس کی زندگی کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔ اُس کے اندر وہ برائی پیدا ہوجاتی ہے، جس کو بے اصولی کی روش (unprincipled behaviour) کہا جاتا ہے۔ یہی وہ کردار ہے، جس کو شریعت کی زبان میں منافق کہا گیا ہے۔

منافقانہ روش کا دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کے اندر ذہنی ارتقا (intellectual development) کا عمل رک جاتا ہے۔ خالق نے اس کی فطرت میں جو ارتقائی امکانات رکھے ہیں، وہ سب کے سب بند پڑے رہتے ہیں، وہ اپنا ظہور نہیں پاتے۔ یہاں تک کہ ایسا انسان دھیرے دھیرے حیوان بشکل انسان بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ بظاہر خوبصورت الفاظ بولتا ہے، لیکن وہ اعلی کیریکٹر سے یکسر محروم ہوتا ہے۔

# ہجرت ایک تدبیر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مکہ میں ہوئی۔ تیرہ سال کے بعد آپ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ ہجرت کا لفظی مطلب ہے، ایک مقام کو چھوڑ کر دوسرے مقام پر جانا۔ اسلام کے دورِاول کی تاریخ میں ہجرت کوئی پراسرار واقعہ نہ تھا۔ یہ حالات کے پیش نظر ایک تدبیر کا معاملہ تھا، جو نتیجہ کے پہلو سے نہایت کامیاب ہوا۔

ہجرت اپنی حقیقت کے اعتبار سے مقام عمل کو بدلنے کا نام ہے۔ اسلام کا اصل مشن دعوت الی اللہ ہے۔ اصولی اعتبار سے اسلام کا مشن ہمیشہ ایک رہے گا۔ لیکن تدبیر کا تعلق حالات سے ہوتا ہے۔ اس لئے داعی کو یہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ حالات کا مطالعہ کرے، وہ ہر قسم کی جذباتیت سے الگ ہوکر وقت کی صورت حال کا گہرا جائزہ لے۔ اس کے بعد حالات کے اعتبار سے دعوت کا ایسا منصوبہ بنائے جو اپنے مقصد کے اعتبار سے زیادہ موثر ہونے والا ہو۔

تدبیر کی مختلف صورتیں ہیں، مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوتی جدو جہد کے آغاز میں تین سال تک دعوت کا کام انفرادی ملاقاتوں کے انداز میں کیا، یہ ایک تدبیر کا معاملہ تھا۔ اس زمانے میں کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، آپ نے بتوں کی موجودگی کو نظر انداز کرکے ان کے زائرین کے درمیان پرامن دعوت کا کام کیا۔ مکہ میں مخالفت بڑھی تو آپ نے اپنے مقام کو بدلا، اور مکہ سے تقریباً تین سو میل دور مدینہ کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا۔ حدیبیہ کے موقع پر آپ نے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر مدینہ واپسی کا فیصلہ کیا، وغیرہ۔

یہ سب تدبیر کے واقعات تھے۔ تدبیر دراصل حکیمانہ منصوبہ بندی کا دوسرا نام ہے۔ دعوت کے لئے نظری اعتبار سے سب سے زیادہ اہمیت توحید کی ہے۔ اور عملی اعتبار سے سب سے زیادہ اہمیت حکیمانہ تدبیر کی۔ ان دونوں پہلوؤں کی کامل رعایت کا نام کامیاب دعوت ہے۔ ہجرت اپنے وسیع تر معنی میں اسی حکیمانہ اصول کا نام ہے۔

# فرشتوں کی نگرانی

خراسان کے مشہور عالم حدیث ابو القاسم ابراہیم النصر آبادی (وفات: 369ھ) نے حج کا قصد کیا تو ان کے شاگرد ابوعبد الرحمن السُلمی (وفات: 412) نے بھی ان کے ساتھ سفر حج پر جانے کا ارادہ کیا، اس وقت ان کی ماں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے: توجهتَ إلى بيت الله، فلا يكتبن عليك حافظاك شيئاً، تستحي منه غدا (سير أعلام النبلاء: 17/249) یعنی تم نے بیت اللہ جانے کا قصد کیا ہے تو ہرگز ایسا نہ ہو کہ تمھارے دونوں محافظ فرشتے تمھارے بارے میں کوئی ایسی بات لکھیں، جس پر تم کو کل شرمندہ ہونا پڑے۔

حج کی عبادت کے دوران آدمی بہت سے لوگوں کے درمیان ہوتا ہے، لوگوں سے ملنے جلنے کے دوران طرح طرح کے موافق وغیر موافق معاملات پیش آتے ہیں۔ اس لئے اس کا امکان رہتا ہے کہ حاجی سے اس طرح کی اخلاقی برائیاں سرزد ہوں جس کو قرآن میں فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرة: 199) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایسے موقع پر برائی سے بچنے کی صورت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی جو کچھ بولے، یا جو معاملہ کرے، وہ یہ سوچ کر کرے کہ بظاہر اگر چہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، انسان کے ساتھ کر رہا ہے، لیکن آخر کار اس کا سارا معاملہ اللہ کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔ یہ سوچ آدمی کے اندر شدید قسم کی جواب دہی کا احساس پیدا کرے گی۔

یہ معاملہ صرف سفر حج کا نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے، روزمرہ کی زندگی میں آدمی روزانہ دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس اجتماعی زندگی کے دوران کبھی وہ کچھ بولتا ہے، کبھی وہ کسی سے کچھ معاملہ کرتا ہے، اس دوران اس کو چاہیے کہ بظاہر اگر وہ انسان سے معاملہ کر رہا ہے مگر یہ سوچ کر کہ اس کے پورے قول وعمل کا ریکارڈ فرشتے تیار کر رہے ہیں، اور یہ ریکارڈ آخر کار اللہ رب العالمین کے سامنے پیش ہونے والا ہے، جو آدمی اس سوچ کے ساتھ دنیا میں رہے اس کی پوری زندگی درست زندگی بن جائے گی۔

# توسط اور اعتدال

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: خير الأمور أوساطها (شعب الإيمان للبيهقي، حدیث نمبر 5819) یعنی معاملات میں سب سے اچھا طریقہ، بیچ کا طریقہ ہے۔ اس حدیث میں امور سے مراد عملی معاملات ہیں، نہ کہ نظریاتی معاملات۔ جہاں تک نظریہ کی بات ہے، اس میں ہمیشہ توحد مطلوب ہوتا ہے، اور عملی معاملات میں تعدد کا طریقہ درست ہے۔

نظریہ کا تعلق آدمی کے یقین سے ہوتا ہے۔ نظریہ کے معاملہ میں ضروری ہے کہ آدمی اس کو یقین کے ساتھ اختیار کرے، اور یقین ہمیشہ اس وقت حاصل ہوتا ہے، جب کہ آدمی کسی ایک بات کو واحد طور پر درست بات مانے۔ اگر آدمی کئی باتوں کو یکساں طور پر درست سمجھے، تو اس سے آدمی کے اندر یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی، جب کہ سچائی کے ساتھ یقین ضروری ہے۔ لیکن عملی معاملات کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں اگر توحد کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس سے ٹکراؤ پیدا ہوگا۔ اس لئے اجتماعی معاملات میں درست بات یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے، کوئی ایسا درمیانی طریقہ اختیار کیا جائے، جس میں ٹکراؤ کے بغیر کام کیا جاسکتا ہو۔

جہاں تک عبادت کے طریقے میں اختلاف کا معاملہ ہے، ان میں بھی تعدد کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ کیونکہ اصحاب رسول کے یہاں طریقۂ عبادت میں فرق پایا جاتا تھا۔ اس فرق یا اختلاف کے معاملہ میں فقہاء نے ترجیح کا اصول اختیار کرکے، ایک طریقہ متعین کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ درست نہیں۔

اس معاملہ میں درست بات یہ ہے کہ عبادت کے طریقوں میں صحابہ کے اختلاف کو تنوع (diversity) پر محمول کیا جائے اور صحابہ سے ثابت شدہ ہر طریقہ کو یکساں طور پر درست مانا جائے۔ ہر ایک کو یہ اختیار ہو کہ وہ جس صحابی کے طریقہ کی چاہے پیروی کرے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: أصحابي كالنجوم فبأيهم اقتديتم اهتديتم (مشكاة المصابيح، حدیث نمبر 6018)۔

# راستہ بدلنا

سیرتِ رسول کی کتابوں میں ایک واقعہ آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے سفر میں مدینہ سے نکلے، درمیان میں معلوم ہوا کہ فریق مخالف کے ایک سردار ایک فوجی دستہ کے ساتھ مقابل سمت سے آرہے ہیں۔ آپ نے چاہا کہ دونوں گروہوں میں ٹکراؤ نہ ہو۔ چنانچہ آپ نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: من رجل يخرج بنا على طريق غير طريقهم التي هم بها (ابن هشام: 4/276) تم میں سے کون شخص ہے جو ہم کو ایک ایسے راستے سے لے جائے جو ان لوگوں کے راستے سے مختلف ہو۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ میں ایسا کرسکتا ہوں۔ چنانچہ رسول اللہ اور آپ کے اصحاب اس بدلے ہوئے راستے سے آگے چلے گئے اور دونوں گروہوں کے درمیان ٹکراؤ پیش نہیں آیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ٹکراؤ سے بچنے کے لئے راستہ بدلنا بھی ایک سنت ہے۔ مثلاً دو جلوس ایک ہی راستے پر آمنے سامنے سے آرہے ہوں تو رسول اللہ کی سنت پر چلنے والا وہ ہے، جو ٹکراؤ سے بچنے کے لئے اپنا راستہ (route) بدل دے۔

اسی طرح اگر کسی جگہ دو گروہ ہوں، ان میں سے ایک گروہ سیاست کے راستے پر چل رہا ہو تو دوسرے گروہ کو چاہئے کہ وہ پر امن دعوت کے راستے پر چلے تاکہ دونوں گروہوں کے درمیان ٹکراؤ پیش نہ آئے۔ اسی طرح زندگی کے مختلف راستے ہیں، اور کام کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ جب بھی ایسا ہو کہ لوگ دو گروہوں میں بٹ جائیں تو دونوں میں سے وہ گروہ پیغمبر کے نمونے پر قائم ہے، جو اپنے طریقے میں ایسی تبدیلی کرے، جس سے دونوں گروہوں کے درمیان ٹکراؤ کا امکان ختم ہو جائے۔ یہ راستہ بدلنے کی سنت ہے۔ یہ اجتماعی زندگی میں ٹکراؤ سے بچنے کا فطری طریقہ ہے۔ اس سنت رسول کی حکمت یہ ہے کہ مقصد کی طرف سفر میں کوئی رکاوٹ واقع نہ ہو، اور کسی تاخیر کے بغیر اصل مقصد کی طرف سفر بدستور جاری رہے۔

# اسلامائزیشن آف نان اسلام

موجودہ زمانے میں بہت سی بدعتیں رائج ہیں۔ بدعت کیا ہے، بدعت دراصل غیر اسلام کو اسلامی بنانے کا دوسرا نام ہے:

Bid‘a: Islamization of non-Islam

بدعت کے نام سے لوگ صرف کچھ معروف بدعتوں کو جانتے ہیں، مگر ان معروف بدعتوں کے سوا اور بھی بہت سی بدعتیں ہیں جو موجودہ زمانے میں شاندار طور پر مسلمانوں کے درمیان رائج ہیں، جن کو ماڈرن بدعت کہا جاسکتا ہے۔ ان ماڈرن بدعتوں کا ارتکاب مسٹر اور مولوی دونوں قسم کے لوگ یکساں طور پر کررہے ہیں۔ بدعت کی کوئی لگی بندھی فہرست نہیں بنائی جاسکتی۔

ماڈرن بدعتیں کیا ہے۔ وہ ہیں — آؤٹنگ، شاپنگ، فیملی فنکشن، میرج سریمنی، افطار پارٹی، عیدملن، جشن شب قدر، خطبہ (engagement) سریمنی، نکاح سریمنی، ولیمہ سریمنی، وغیرہ۔

بدعت کا لفظی مطلب نئی چیز (innovation) ہے۔ یعنی دین میں کوئی نئی بات نکالنا۔ اسلام میں رسول اور اصحاب رسول کو نمونہ (model) کا درجہ حاصل ہے۔ بعد کے زمانے میں مسلمانوں کی روش کو اسی ماڈل سے جانچا جائے گا۔ جو طریقہ رسول اور اصحابِ رسول کے مطابق ہو، وہ سنت ہے، اور جو طریقہ رسول اور اصحاب کے نمونے کے مطابق نہ ہو، وہ بدعت ہے اور بدعت کو حدیث میں ضلالت (صحیح مسلم، حدیث نمبر: 867) کہا گیا ہے۔

کچھ لوگ جب کسی نئی چیز کو اسلام میں داخل کریں تو ان کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس کے جواز (justification) کے لئے کسی آیت یا حدیث کا حوالہ دیں۔ ایسے لوگ آیت یا حدیث کی غلط تشریح کرکے اس سے اپنے طریقے کو جائز ثابت کرتے ہیں۔ یہ طریقہ غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے، یعنی ایک غلط کام کرنا اور پھر قرآن وحدیث کی غلط تاویل کرکے اس کو صحیح ثابت کرنا۔ بدعت دراصل نان اسلام کو اسلامائز کرنے کا دوسرا نام ہے۔

# شعور پر لاشعور غالب

انسان کا دماغ ایک بے حد پیچیدہ مشین ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں۔ اس کا ایک نازک پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی چیز انسان کے لاشعور (unconscious mind) میں داخل ہو جائے تو وہ انسان کے شعور (کانشش مائنڈ) پر غالب آجاتی ہے۔ ایسی چیز کو انسان بلا ارادہ دہراتا رہتا ہے۔ اگر وہ اپنے شعور کو بیدار کرکے اس کو روکنا چاہے تو صرف وقتی طور پر شعور اس کے اوپر موثر ہوگا۔ جیسے ہی شعور میں کوئی دوسری بات آئی فوراً لاشعور اپنا کام کرنے لگے گا۔

انسان کو چاہئے کہ وہ ہر وقت اپنا سخت محاسبہ کرتا رہے۔ وہ کوشش کرے کہ وہ کسی چیز کا اتنا عادی نہ بنے کہ وہ اس کے لاشعور کا حصہ بن جائے۔ کیوں کہ ایسا ہوتے ہی وہ انسان کے شعور کی پکڑ سے باہر ہو جائے گا۔ انسان غلطی کرے گا اور وہ یہ بھی نہ جانے گا کہ وہ غلطی کر رہا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تم ایسے اعمال سے بچو جن کے کرنے سے تمھارے اعمال حبط ہو جائیں، حالانکہ تم کو اس کا شعور بھی نہ ہو (2:49)۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان ہر وقت اپنا محاسبہ کرتا رہے۔ وہ اس بات کی بہت زیادہ کوشش کرے کہ کوئی غلط عادت اس پر اتنی زیادہ نہ چھا جائے کہ وہ اس کے لاشعور کا حصہ بن جائے۔ کیونکہ ایسا ہونے کے بعد وہ غلط کام کرے گا جب کہ وہ شعوری طور پر یہ بھی نہ جانے گا کہ وہ غلط کام کر رہا ہے۔ لیکن آیت کے مطابق لاشعور کے تحت غلط کام کرنا بھی قابل مواخذہ ہے۔ اس لئے آدمی کو اس معاملہ میں بہت زیادہ چوکنا ہونا چاہئے۔

لاشعور کے تحت کیا ہوا عمل بھی کیوں قابل مواخذہ ہے، یہ بات نتیجہ کے اعتبار سے کہی گئی ہے۔ آپ اپنے لاشعور کے تحت غلطی کریں، تب بھی اس کا نتیجہ غلط ہی نکلے گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ لاشعور کے تحت کی ہوئی غلطی اپنا نتیجہ ظاہر نہ کرے۔ ایسی حالت میں انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے ہر عمل سے پہلے سوچے، اور اس کے بعد عمل کرے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ انسان اپنے عمل کے بارے میں آخری حد تک حساس بن جائے۔

# یتیم کی کفالت

یتیم کی کفالت ایک ایسا عمل ہے جس کو اسلام میں بہت بڑا درجہ دیا گیا ہے۔ یتیم کی کفالت آدمی کو جنت کا مستحق بناتی ہے۔ یتیم کی کفالت کے بارے میں کئی روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے: عن سهل بن سعد، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "أنا وكافل اليتيم في الجنة هكذا" وقال بإصبعيه السبابة والوسطى (صحیح البخاری: 6005) یعنی سہل بن سعد روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا، جنت میں اس طرح قریب ہوں گے، جیسے میرے ہاتھ کی دو انگلیاں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یتیم کی کفالت کرے اس کو جنت میں پیغمبر سے قربت کا درجہ ملے گا۔

کفالت کا مطلب ہے، نان نفقہ کی ذمے داری (to provide support)۔ یعنی کوئی بچہ یتیم ہوجائے تو اس کی خبر گیری کرنا، اس کی ضروریاتِ زندگی کا ضامن بن جانا، اس کی تعلیم اور اس کے اقتصادیات کا انتظام کرنا، وغیرہ۔

اسلام کے مطابق، یتیم کی کفالت ایک اعلی اخلاقی اصول ہے۔ جب ایک بچہ اپنے فطری سرپرست سے محروم ہوجائے تو اس کے رشتہ داروں اور اس کے جاننے والوں اور حکومت کا یہ فرض ہوجاتا ہے کہ وہ اس کا سہارا بنیں۔ وہ اس کو اس قابل بنائیں کہ وہ بڑا ہوکر خود کفیل زندگی گزارنے کے قابل ہوجائے۔ وہ دوسرے لوگوں کی طرح باعزت زندگی گزارنے لگے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے یہ صرف ایک اخلاق کا معاملہ نہیں، بلکہ وہ خود اپنے لیے عمل کی زبان میں ایک دعا ہے۔ جس آدمی کو یتیم پر رحم آئے، اور وہ اس کا سپورٹر بن جائے۔ وہ گویا عمل کی زبان میں یہ دعا کر رہا ہے کہ خدایا، آخرت کے دن میں اسی طرح ایک تنہا انسان بن جاؤں گا، میرے تمام دنیوی سہارے مجھ سے چھوٹ جائیں گے، اس وقت تو میری مدد فرما، اپنی رحمت کے ذریعے مجھ کو آخرت کے دور میں جنتی زندگی عطا فرما۔ اسلامی عقیدہ کفالت کے معاملے کو ایک ذاتی محرک (incentive) عطا کرتا ہے۔

# پیغمبرِ اسلام کی سنت

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن توحید کا مشن تھا۔ آپ نے اپنے مشن کا آغاز 610 عیسوی میں مکہ میں کیا۔ 632 عیسوی میں مدینہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کو اس دوران بار بار مسائل (problems) پیش آئے۔ آپ نے ہمیشہ اس اصول پر عمل کیا جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا تھا— رجز کو چھوڑو، اور انذار (دعوت) کا پیس فل مشن جاری رکھو (المدثر: 2-5)۔ رسول اللہ کی اس پالیسی کو حضرت عائشہ نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے: ما خیر النبي صلی اللہ علیہ وسلم بین أمرین إلا اختار أیسرھما (صحیح البخاری، حدیث: 6786) یعنی رسول اللہ کو جب بھی دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کا انتخاب کرتے۔ دوسرے الفاظ میں آپ کا مستقل اصول یہ تھا کہ مسائل کو نظر انداز کرو، اور مواقع کو استعمال کرو۔

Ignore the problems, avail the opportunities

اس پیغمبرانہ طریقے کی چند مثالیں یہ ہیں۔ مکی دور میں کعبہ کی عمارت میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے ان بتوں سے عملاً کوئی تعرض نہیں کیا۔ بلکہ وہاں جو لوگ ملتے تھے ان کو آپ توحید کا پرامن پیغام پیش کرتے رہے۔ قریش نے آپ کے خلاف مقاطعہ (boycott) کا فیصلہ کیا تو آپ نے قریش سے ٹکراؤ نہیں کیا، بلکہ مقاطعہ کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے پرامن طور پر شعبِ ابی طالب میں چلے گیے۔ اہل مکہ نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ مکہ چھوڑ دیں تو آپ نے اہل مکہ سے جنگ نہیں کی بلکہ ہجرت کرکے پرامن طور پر مدینہ چلے گیے۔ حدیبیہ کے موقع پر مکہ کے سرداروں نے آپ کو اس سے روکا کہ آپ مکہ جا کر عمرہ کریں، آپ نے اس موقع پر ان سے ٹکراؤ نہیں کیا بلکہ حدیبیہ سے واپس ہو کر مدینہ چلے گیے، وغیرہ۔

اسی کے ساتھ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کچھ اور مثالیں ہیں۔ مثلاً بدر کے

موقعے پر آپ نے قریش سے قتال کیا، احد کے موقعے پر آپ نے اہل مکہ سے جنگ کی، حنین کے موقع پر آپ نے قبیلۂ ہوازن سے جنگی مقابلہ کیا، وغیرہ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بعد کے زمانے کے مسلم علماء اور مسلم رہنماؤں نے کبھی اس سنت رسول پر عمل نہیں کیا۔ انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ مسائل کو نظر انداز کریں، اور مواقع کو استعمال کرتے ہوئے دعوت الی اللہ کا کام کریں۔ گویا بعد کے زمانے میں ہر بار انھوں نے اختیار ایسر (easier option) کے بجائے اختیار اعسر (harder option) کے طریقے پر عمل کیا۔

مثلاً موجودہ زمانے میں نوآبادیات (colonialism) کا مسئلہ پیدا ہوا۔ یہاں پر دوبارہ یہ امکان تھا کہ مسلم علماء اور مسلم رہنما ٹکراؤ کے بجائے پرامن دعوت کے طریقے پر عمل کریں، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اسی طرح صہیونیت (Zionism) کا مسئلہ پیدا، اور 1948 میں فلسطین کے نصف حصے پر اسرائیل کی حکومت قائم ہوگئی۔ یہاں بھی مسلم رہنماؤں کے لیے یہ موقع تھا کہ وہ مسئلے کو نظر انداز کرتے ہوئے پرامن دعوت کا کام کریں۔ مگر تمام مسلم رہنما خواہ وہ عرب ہوں یا نان عرب، سب نے متفقہ طور پر اسرائیل کے معاملے میں ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا۔ اس معاملے میں وہ اس انتہا تک پہنچ گیے کہ خودکش بمباری (suicide bombing) کو جائز ٹھہرا دیا، وغیرہ۔

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس فرق کا سبب وہی ہے جس کو مختلف حدیثوں میں پیشگی طور پر بتا دیا گیا تھا۔ وہ یہ کہ امت مسلمہ بعد کے زمانے میں انحراف کا شکار ہوجائے گی۔ امت مسلمہ کا یہ بگاڑ اس نوبت تک پہنچ جائے گا کہ اصل دین امت کے اندر غریب (صحیح مسلم، حدیث نمبر 145) ہوجائے گا۔ یعنی اصل دین لوگوں کے درمیان اجنبی دین بن جائے گا، اور خود ساختہ دین لوگوں کے درمیان معروف دین کی حیثیت اختیار کرلے گا۔

بعد کے زمانے میں پیش آنے والا ظاہرہ اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں پیش آنے والے حالات کے نتیجے میں امت کے اندر دین کا نشانہ بدل گیا۔ حالات کے زیرِ اثر انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ امتِ مسلمہ کا مشن یہ ہے کہ وہ امت کا سیاسی غلبہ زمین پر قائم کریں۔ وہ ہر

جگہ دوسری قوموں کو مغلوب کرکے اپنے آپ کو سیاسی طور پر غالب کریں۔ اس عمل کو انھوں نے اجتہادی خطا کے طور پر خلافت یا اسلامی حکومت کا نام دے دیا۔ حالاں کہ یہ مشن تمام تر ایک قومی مشن تھا۔ اس کا دینِ اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ امت مسلمہ کا مستقل مشن قرآن کے مطابق شہادت علی الناس (2:143) ہے۔ اس مشن میں ساری اہمیت پر امن جدو جہد کی تھی۔ اس مشن کا جنگ وقتال سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس مشن کا تقاضا تھا کہ اہل ایمان مسائل کو نظر انداز کریں اور پر امن طور پر دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھیں۔

مگر جب ایسا ہوا کہ بعد کے حالات کے نتیجے میں مسلم رہنماؤں نے سیاسی اقتدار کو اپنا نشانہ بنالیا تو اس کے فطری تقاضے کے تحت ایسا ہوا کہ وہ قوموں سے جنگ وقتال کے عمل میں مصروف ہوگیے۔ انھوں نے جہاد کی خود ساختہ تشریح کرکے اپنے متشددانہ طریقۂ کار کو غلط طور پر جہاد کا نام دے دیا۔ حالاں کہ جہاد قرآن میں پر امن جدو جہد کا نام (25:52) ہے نہ کہ متشددانہ ٹکراؤ کا۔

مسلم علماء اور مسلم رہنماؤں کے اندر اگر پیغمبرانہ مزاج ہوتا، اور وہ غیر متاثر ذہن کے تحت قرآن وسنت کا مطالعہ کرتے تو وہ یقینا جان لیتے کہ پیغمبرِ اسلام کا مستقل مشن صرف ایک تھا، اور وہ پر امن دعوت الی اللہ۔ پر امن دعوت آپ کی زندگی کا حقیقی حصہ (real part) تھا، اور آپ کی زندگی میں چند بار جو جنگ وقتال کا مرحلہ پیش آیا وہ آپ کی زندگی کا اضافی حصہ (relative part) تھا۔

## روزہ

روزہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے رک جائے،
وہ غلط کام نہ کرے، غلط گفتگو سے پرہیز کرے،
غلط زندگی میں نہ پڑے، حتی کہ اگر حکم ہو تو کھانا پینا بھی چھوڑ دے۔
یہی روزہ ہے جس کا ہر سال رمضان میں سبق دیا جاتا ہے۔

# نظر کی خریداری

ایک صاحب مجھ کو اپنے گھر لے گیے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا گھر مختلف قسم کے سامانوں سے بھرا ہوا ہے۔ پورا گھر ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے گھر میں اتنا زیادہ سامان کیوں ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب میں بازار جاتا ہوں اور وہاں میں کسی چیز کو دیکھتا ہوں، وہ مجھ کو پسند آجاتی ہے تو میں اس کو خرید لیتا ہوں۔ یہ نظر کی خریداری ہے۔ اکثر لوگوں کا حال یہی ہے کہ وہ چیزوں کو دیکھ کر خریدتے ہیں، خواہ وہ ان کے استعمال میں آنے والی ہوں یا نہ ہوں۔

خریداری کی دو قسمیں ہیں — نظر کی خریداری اور ضرورت کی خریداری۔ نظر کی خریداری وہ ہے جو دیکھ کر کی جائے۔ اس کے برعکس، ضرورت کی خریداری یہ ہے کہ آپ کو ایک چیز کی ضرورت ہو، اس کو حاصل کرنے کے ارادے سے آپ گھر سے نکلیں اور جہاں وہ چیز ملتی ہو، وہاں جا کر اس کو خرید لیں۔

نظر کی خریداری دوسرے الفاظ میں بے مقصد خریداری ہے۔ وہ اپنے وقت اور اپنے مال کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں مال کی تبذیر (17:26) بتایا گیا ہے۔ یعنی مال کو بلا ضرورت بکھیرنا۔ ضرورت کی خریداری ایک ذمہ دارانہ فعل ہے، اور نظر کی خریداری ایک غیر ذمہ دارانہ فعل۔

کسی مرد یا عورت کے پاس جو مال ہے، وہ اللہ کا دیا ہوا ہے، وہ اللہ کی ایک امانت ہے۔ جو عورت یا مرد مال کو مسرفانہ طور پر خرچ کریں، وہ خدا کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسا کام کرتے ہیں، جس کے لیے آخرت میں ان کی سخت پکڑ ہوگی۔ مال کو جائز ضرورت پر خرچ کرنا ثواب کا کام ہے۔

اس کے برعکس، اگر مال کو غیر ضروری مدوں میں خرچ کیا جائے تو وہ خرچ کرنے والے کے لیے ایک گناہ بن جاتا ہے۔ مال کو خرچ کرنے کے معاملے میں انسان کو بہت زیادہ محتاط ہونا چاہئے۔

# حقیقت پسندانہ سوچ

دنیا میں جو برائیاں (evils) ہیں ان سب کا سبب صرف ایک ہے- اور وہ ہے لوگوں میں اَیزاِٹ از تھنکنگ(as it is thinking) کا نہ ہونا- غصہ،نفرت، انتقام، عدم برداشت، تشدد وغیرہ سب کی اصل جڑ یہی ہے- ایز اٹ از تھنکنگ کا مطلب ہے مبنی برحقیقت سوچ-

غور کیا جائے تو یہی وہ چیز ہے جس کو شیطان کا کلچر (satanic culture) کہا گیا ہے- شیطان یا ابلیس جنوں کا سردار تھا- پیدائش آدم کے وقت اس نے یہ اعتراض اٹھایا کہ خدا نے انسان کو خلیفۃ الارض بنادیا اور جنات کو کچھ نہیں دیا- یہ انتخابی طرز فکر کی پہلی مثال تھی- جن کو جو اختیارات دیے گئے تھے اس کے لحاظ سے گویا وہ خلیفۃ الکون تھا- مگر ابلیس نے یہ کیا کہ جو کچھ اس کو ملا ہوا تھا، اس کا اعتراف نہیں کیا، اور جو کچھ انسان کو دیا گیا تھا اسی کا ذکر یک طرفہ طور پر کیا- اسی یک طرفہ طرز فکر سے ساری برائیاں پیدا ہوئیں- ابلیس کا یہی کلچر آج تک ساری دنیا میں جاری ہے-

سارے انسانوں کی مشترک برائی بتانا ہو تو وہ صرف ایک ہوگی- اور وہ انتخابی سوچ (selective thinking) ہے- ہر عورت اور مرد یہ کرتے ہیں کہ اپنے بارے میں ایک ڈھنگ سے سوچتے ہیں، اور دوسرے کے بارے میں دوسرے ڈھنگ سے- اپنے آپ کو ایک معیار سے جانچتے ہیں، اور دوسرے کو دوسرے معیار سے- اپنی پسند کے لوگوں کا ذکر کرنا ہو تو وہ ان کی صرف اچھائیاں بیان کریں گے، اور اگر ان لوگوں کا ذکر کرنا ہو جو انھیں پسند نہیں ہیں تو ان کی صرف برائیاں بیان کریں گے- ایک قوم کے بارے میں وہ منفی رپورٹنگ(negative reporting) کریں گے، اور دوسری قوم کے بارے میں صرف مثبت رپورٹنگ (positive reporting)- ایک گروہ ان کو ظالم نظر آئے گا اور دوسرا گروہ مظلوم دکھائی دے گا- ایک کے لئے ان کے دل میں صرف نفرت ہوگی، اور دوسرے کے لئے صرف محبت — یہی وہ چیز ہے جس نے لوگوں کو حقیقت پسندانہ سوچ (realistic approach) سے محروم کردیا ہے-

# مزاحمت سے مقابلہ تک

انگریز شاعر لارڈ بائرن (وفات: 1824) ایک آزاد پسند شاعر تھا۔ اس نے غالباً پہلی بار منفعل مزاحمت (passive resistance) کی اصطلاح استعمال کی۔ اس کے بعد یہ اصطلاح کافی مقبول ہوئی۔ خود مسلم تحریکوں نے بھی، اس اصطلاح کو ایک پسندیدہ اصطلاح سمجھ کر اختیار کرلیا۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ہر جگہ منفعل مزاحمت آخر کار متشددانہ مزاحمت میں تبدیل ہوگئی۔

اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب انسان کا غیر مطمئن مزاج (non-stable nature) ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ ایک چیز کو اپنا نشانہ بنا کر اس کے لیے کوشش شروع کرے تو وہ اپنے نشانہ کو پانے سے پہلے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ خواہ اسی راہ میں وہ اپنے آپ کو تباہ کرلے۔

موجودہ زمانے کی مختلف جماعتوں نے سیاسی انقلاب کو اپنا نشانہ بنایا۔ ابتداءً انھوں نے کہا کہ ہم اپنی تحریک کو پر امن انداز میں چلائیں گے۔ پھر جب پر امن طریقہ کار سے نشانہ حاصل نہیں ہوا تو انھوں نے منفعل مزاحمت (passive resistance) کی اصطلاح وضع کی، اور اس کے مطابق کام شروع کیا۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ اِس سے بھی ان کا نشانہ حاصل نہیں ہو رہا ہے، تو انھوں نے فعال مزاحمت (active resistance) کا طریقہ اختیار کیا۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ اس سے بھی ان کا نشانہ حاصل نہیں ہو رہا ہے تو انھوں نے متشددانہ عمل (violent activism) کا طریقہ اختیار کیا۔ پھر جب اس سے بھی ان کا نشانہ حاصل نہیں ہوا تو وہ انتہا پسندی کی آخری حد تک پہنچ گئے اور مفروضہ دشمن کے خلاف خودکش بمباری (suicide bombing) کرنے لگے، تاکہ اگر وہ دشمن کو مغلوب نہ کرسکیں تو کم ازکم اس کو غیر مستحکم (de-stabilise) کردیں۔

کسی تحریک کا نشانہ صرف وہ ہوسکتا ہے جو مثبت نتیجہ تک پہنچے، نہ کہ منفی تباہ کاری تک۔ کسی تحریک یا اس کے طریقہ کار پر رائے قائم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کو نتیجہ (result) کے اعتبار سے جانچا جائے۔ اس معاملے میں کسی اور چیز کو معیار قرار دینا درست نہیں۔

# علم کی حد

فلسفی یا سائنس داں، جس شخص نے بھی گہرا علمی مطالعہ کیا ہے، آخر میں وہ اس رائے پر پہنچا ہے کہ انسانی علم کی ایک حد ہے- اس حد سے آگے انسان کے لیے جانا ممکن نہیں- مثال کے طور پر فلسفیوں کے درمیان یہ بحث تھی کہ انسان کے وجود کا علمی ثبوت کیا ہے- مشہور فلسفی ڈیکارٹ نے کہا کہ میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں:

I think therefore I exist.

مگر یہ جواب کافی ثابت نہیں ہوا- کیوں کہ دوبارہ یہ سوال سامنے آیا کہ یہ تو ایک داخلی ثبوت (subjective evidence) ہے نہ کہ موضوعی ثبوت (objective evidence)- داخلی ثبوت کسی شخص کو ذاتی یقین دے سکتا ہے، لیکن دوسرے شخص کے لیے اس میں یقین کا سامان موجود نہیں۔ یہ یک طرفہ ثبوت ہے، نہ کہ دوطرفہ ثبوت۔

سائنس دانوں نے طبیعیاتی دنیا کا مطالعہ شروع کیا- آخر میں وہ ایٹم تک پہنچے- لیکن ایٹم بھی ٹوٹ گیا اور اس کے بعد جو کچھ تھا وہ ناقابل مشاہدہ تھا، یعنی ایک سائنس داں کے الفاظ میں قیاسی لہریں (waves of probability)- اس کے بعد سائنس داں اس ناقابل حل سوال میں مبتلا ہو گئے کہ ہماری دنیا کا وجود خارجی (objective) ہے یا داخلی (subjective)-

علم کے تمام شعبوں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ انسان اپنی موجودہ صلاحیت کے ساتھ اس کی آخری حد تک نہیں پہنچ سکتا- ایسی حالت میں یہ سب سے بڑا علم ہے کہ انسان علم کی حد کو جانے- اس حقیقت کا اعتراف نہ کرنا بے حد خطرناک ہے- کیوں کہ وہ آدمی کو صرف کنفیوزن (confusion) تک پہنچائے گا، نہ کہ یقین تک- علم کا آخری مطلوب یقین ہے- جو طریق مطالعہ یقین تک پہنچائے وہ علم ہے، اور جو طریق مطالعہ بے یقینی یا کنفیوزن تک پہنچائے، وہ بلاشبہہ بے علمی ہے، خواہ کوئی شخص اس کو علم کا درجہ دیتا ہو-

# بے خبری کا نقصان

برطانیہ کے ایک پروفیشنل ڈرائیور نے ایک کتاب لکھی ہے۔ اِس کتاب میں اُس نے یہ بتایا ہے کہ گاڑی چلانے کے اصول کیا کیا ہیں۔ اُس نے لکھا ہے کہ اگر آپ ایک روڈ پر اپنی کار دوڑا رہے ہیں، اور اچانک آپ یہ دیکھتے ہیں کہ سائڈ کی لین سے نکل کر ایک گیند روڈ پر آ گئی ہے، تو آپ کو جاننا چاہئے کہ اِس گیند کے پیچھے ایک بچہ بھی آرہا ہوگا۔ اگر آپ اس حقیقت کو نہ جانیں، اور اپنی کار دوڑاتے ہوئے بچے کو کچل دیں تو آپ بچے کی موت سے بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔ آپ کو بچے کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔ اِس معاملہ میں آپ کا یہ عذر نہیں سنا جائے کہ آپ نے بچے کو نہیں دیکھا تھا۔

یہ ایک ایسا اصول ہے، جس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ اِس کو باخبری کا اصول (principle of awareness) کہا جاسکتا ہے۔ عملی اعتبار سے اِس اصول کی بے حد اہمیت ہے۔ جو شخص اس اصول سے بے خبر ہو، وہ اپنی زندگی میں ہمیشہ غیر ضروری مسائل سے دوچار رہے گا۔ اُس کو کبھی سکون حاصل نہ ہوگا۔ مزید یہ کہ اپنی بے خبری کی بنا پر وہ غلطی کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتا رہے گا۔ اِس اصول کا تعلق خاندانی زندگی سے بھی ہے، اور سماجی زندگی سے بھی۔ اِس اصول کا تعلق قومی زندگی سے بھی ہے، اور بین اقوامی زندگی سے بھی۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ایک ہوشمند انسان بنے۔ اِس دنیا میں بے خبری میں جینا گویا اندھیرے میں جینا ہے۔ جو لوگ بے خبری میں جیتے ہوں، وہ اندھے انسان قرار دیے جائیں گے۔ خواہ ان کے سر پر دو روشن آنکھیں موجود ہوں۔

جس طرح درخت کی شاخیں ہوتی ہیں، اسی طرح انسانی زندگی میں بھی ہر واقعے کی شاخیں ہوتی ہیں۔ اگر آدمی واقعے کو جانے اور اُس کی شاخوں کو نہ جانے، تو ایسے آدمی کو جاننے والا نہیں کہا جائے گا۔ اُس کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ وہ جانتا ہے، مگر وہ نہیں جانتا، وہ دیکھتا ہے، مگر وہ نہیں دیکھتا۔ اُس کو خالق نے دماغ دیا ہے، مگر وہ اپنے دماغ سے سوچتا نہیں۔ وہ ایک نامکمل انسان ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں ایک مکمل انسان۔

# مفید، بے مسئلہ

اجتماعی زندگی (social life) میں باعزت زندگی حاصل کرنے کی ایک لازم شرط ہے۔ اس شرط کا تعلق 50 فیصد آپ سے ہے اور 50 فیصد دوسروں سے۔ وہ یہ کہ آپ دوسروں کے لئے یا تو مفید انسان (giver person) بنیں یا آپ دوسروں کے لئے بے مسئلہ انسان (no-problem person) بن جائیں۔ پہلی صورت زیادہ سے زیادہ شرط کی ہے، اور دوسری صورت کم سے کم شرط کی۔ ان دو کے سوا کوئی تیسری صورت سماج میں باعزت بننے کی نہیں۔ جو لوگ تیسری قسم سے تعلق رکھتے ہوں ان کو کسی سماج میں اگر جگہ ملے گی تو صرف سماج کے کوڑا خانے میں۔ سماج کے مطلوب شخص کا درجہ ان کو کبھی ملنے والا نہیں۔

اجتماعی زندگی ہمیشہ دو اور لو (give and take) کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ اس اصول کے مذکورہ دو پہلو ہیں۔ اگر آپ سماج کو مثبت معنوں میں کچھ دے رہے ہیں تو آپ سماج کے اندر مطلوب انسان کا درجہ پائیں گے، اور اگر آپ اپنی طرف سے سماج کو کچھ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو آپ کو کم از کم یہ کرنا چاہئے کہ آپ دوسروں کے لئے ایک بے مسئلہ انسان بن جائیں۔ اگر آپ سماج کے ایک دینے والے ممبر ہیں تو آپ سماج کی ترقی میں براہِ راست اضافہ کر رہے ہیں، اور اگر آپ سماج کے ایک بے مسئلہ انسان ہیں تب بھی سماج کی ترقی میں آپ کا ایک رول ہے۔ پہلی صورت میں آپ سماج کی ترقی میں براہِ راست حصہ دار ہیں تو دوسری صورت میں آپ سماج کی ترقی میں بالواسطہ حصہ دار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ مذکورہ دونوں شرطوں میں سے ایک شرط بھی پوری نہ کریں، وہ سماج کے لئے صرف ایک بوجھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر چہ روایتی قانون کی نظر میں مجرم (criminal) نہیں ہیں لیکن وہ آدابِ حیات کے پہلو سے یقیناً ایک غیر قانونی مجرم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا کی قانونی عدالت میں اگر چہ ان کے خلاف کسی سزا کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا لیکن فطرت کی عدالت میں وہ بلاشبہہ ایک اخلاقی مجرم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

# شہد کی مکھی کا سبق

ایک مسلم میگزین میں ایک آئٹم ان الفاظ میں چھپا ہوا تھا: ایک استاد نے اپنے طالب علم سے پوچھا، تم شہد کی مکھی سے کیا سیکھ سکتے ہو۔ طالب علم نے جواب دیا: یہی کہ جو چھیڑے اسے ڈنک مارو۔ شہد کی مکھی کا یہ حوالہ درست نہیں۔ شہد کی مکھی میں انسان کے لئے ایک تعمیری سبق ہے، نہ کہ کوئی تخریبی سبق۔

شہد کی مکھی (honey bee) فطرت کا ایک شاہ کار ہے۔ شہد کی مکھی یہ کرتی ہے کہ مسلسل محنت کر کے بے شمار پھولوں سے ان کا نکٹر (nectar) نکالتی ہے، اس کے بعد پر امن منصوبہ بندی کے ذریعے اس کو اپنے چھتے میں جمع کرتی ہے۔ تاکہ انسان کے لئے ایک قیمتی غذا حاصل ہو۔ اس اعتبار سے شہد کی مکھی کا سبق انسان کے لئے یہ ہے کہ تم اپنے سماج کے ایک دینے والے ممبر (giver member) بنو، تم اپنے سماج میں اس طرح تعمیری انداز میں رہو کہ تم سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔

یہ صحیح ہے کہ شہد کی مکھی بعض اوقات انسان کو ڈنک مارتی ہے۔ لیکن شہد کی مکھی کا یہ ڈنک مارنا صرف اپنے بچاؤ کے لئے ہوتا ہے، جب شہد کی مکھی یہ دیکھتی ہے کہ کوئی انسان اس کے چھتے میں مداخلت کر رہا ہے تو وہ اپنے بچاؤ کے لئے ایسے آدمی کو ڈنک مارتی ہے۔ شہد کی مکھی کا ڈنک مارنا صرف اپنے دفاع (defence) کے لئے ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی کے اندر پیدائشی طور پر کسی کے خلاف کوئی منفی سوچ نہیں۔

انسان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انسان کے اندر اَنا (ego) کا جذبہ ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے خلاف بات پر بھڑک اٹھتا ہے، اور انتقام (revenge) کے درپے ہو جاتا ہے۔ انسان ایسے موقعے پر انتقامی کارروائی کرتا ہے، جب کہ انتقام کلچر شہد کی مکھی کی فطرت میں موجود ہی نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ فطرت کے واقعات سے ہمیشہ مثبت سبق (positive lesson) لے، منفی سبق (negative lesson) لینا فطرت کے نظام کے مطابق نہیں۔

1- 12 مارچ 2015 کو پیس سنٹر کیرالہ کی جانب سے آئی ایس ایم کی صوبائی مہم کے موقع پر ہزاروں لوگوں کے درمیان ترجمہ قرآن اور صدر اسلامی مرکز کی کتابیں تقسیم کی گئیں۔

2- سیماندھرا کے کوسٹل شہروشاکھا پٹنم میں 10۔19 اپریل 2015 کے درمیان ایک بک فیئر لگا تھا۔ اس بک فیئر میں حیدرآباد سی پی ایس کی ٹیم نے اپنا بک اسٹال لگایا۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے اس اسٹال کو وزٹ کیا، جس میں ایک بڑی تعداد کالج کے طلبہ کی تھی۔ تقریباً تمام لوگوں نے سب سے پہلے ترجمۂ قرآن کی مانگ کی، اور بہت ہی خوشی اور شکریہ کے ساتھ اس کو حاصل کیا۔

3- سی پی ایس دہلی کی خواتین ٹیم کی ممبران ڈاکٹر نجمہ صدیقی اور ڈاکٹر مسلمہ صدیقی وغیرہ نے خواتین کا ایک اجتماع منعقد کیا۔ یہ اجتماع صدر اسلامی مرکز کے ویڈیو لکچر سے شروع ہوا۔ اس کے بعد لوگوں سے ملاقات اور ان سے گفتگو کا سیشن ہوا۔ یہ پروگرام 13 اپریل 2015 کو دہلی کے دوارکا، سیکٹر 11 میں منعقد کیا گیا تھا۔

4- ابوظبی میں 30 اپریل 2015 کو صدر اسلامی مرکز کو 'فروغ امن فورم' (Forum for Promoting Peace in Muslim Societies) کی جانب سے منعقد تین روزہ کانفرنس کے اختتام پر 'سیدنا الحسن بن علی امن ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ فورم کے سربراہ شیخ عبداللہ بن بیّہ نے اس موقع پر کہا کہ مولانا وحید الدین خاں نے اپنی 90 سال کی عمر میں سے 70 سال سے زیادہ مدت تک فروغ امن کے لئے کام کیا ہے، تاکہ امن، بھائی چارگی، اعراض اور تسامح کا کلچر پیدا ہو۔ اس موقع پر ابوظبی کے وزیر خارجہ شیخ عبداللہ بن زاید آل نہیان اور جامعۃ الازہر کے مفتی اعظم دکتور احمد الطیب بھی موجود تھے۔ اس مناسبت سے صدر اسلامی مرکز نے جو تقریر کی اس کو درج ذیل لنک پر سنا جاسکتا ہے:

http//:cpsglobal.org/content/key-note-address-abu-dhabi-award-ceremony-april-30-2015

5- پاکستان میں سی پی ایس کا مشن انفرادی طور پر بہت عرصے سے چل رہا تھا۔ جون 2013 میں باقاعدہ طور پر ٹیم کی شکل میں یہاں مشن کا کام شروع ہوا، اور اس وقت کراچی، پشاور، اسلام آباد اور لاہور میں کافی سرگرمی کے ساتھ اس مشن کا پرامن دعوتی کام جاری ہے۔ اردو ماہنامہ الرسالہ اور انگریزی میگزین اسپرٹ آف اسلام کو یہاں ری پرنٹ کیا جاتا ہے، اور ان کو سماج کے باشعور طبقہ، خاص طور پر مدارس کے طلباء اور تعلیم یافتہ نوجوانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس وقت کراچی کی 33 سے زائد لائبریریوں میں سی پی ایس کا لٹریچر موجود ہے۔ اس کے علاوہ مختلف بک فیئرس میں شرکت کی گئی، جیسے دسمبر 2013 اور دسمبر 2014 کا کراچی بک فیئر اور فروری 2014 اور فروری 2015 کا لاہور بک فیئر، وغیرہ۔ ان بک فیئرس میں پاکستانی عوام نے کافی حوصلہ افزا رسپانس دیا۔ لوگوں سے ملاقات اور ان سے گفتگو کے دوران یہ معلوم ہوا کہ کراچی میں کافی تعداد میں مولانا کے قدردان موجود ہیں اور مولانا کی کتابیں اگر حاصل ہوں تو ضرور پڑھتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو یہ جان کر کافی مسرت ہوئی کہ الرسالہ اور مولانا کی مطبوعات پاکستان میں دستیاب ہیں۔

ایک بڑی تعداد نے الرسالہ کوسبسکرائب (subscribe) کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایسے بہت سے لوگوں سے تعارف ہوا جنھوں نے مولانا کی کتاب رازحیات پڑھی ہے۔ یہ کتاب نوجوانوں میں کافی مقبول ہے۔کراچی بک فیئر میں تبادلہ خیال کے دوران یہ جاننے کا موقع ملا کہ پاکستان کے اکثر لوگوں کو اس مشن کی ضرورت ہے کیوں کہ تقریباً تمام لوگوں نے اس مشن سے اتفاق کیا۔ انگلش پڑھنے والوں نے اسپرٹ آف اسلام کا والہانہ خیرمقدم کیا۔ بڑی تعداد میں ایسے لوگ آئے جنھوں نے بعد میں رابطے کے لیے آفس اور بک اسٹور کے بارے میں جاننا چاہا۔ بہت سے مدارس میں سی پی ایس کی کتابیں پہلے سے موجود ہیں۔ ان بک فیئرس میں مدارس کے طلبہ سے دوران گفتگو یہ محسوس ہوا کہ وہ لوگ کافی کھلے ذہن کے ہیں اور ان سے کسی بھی موضوع پر کھل کر بات کی جاسکتی ہے۔ اس بک فیئر میں ایک ہزار سے زیادہ کتابیں فروخت ہوئیں اور کثیر تعداد میں مشن کی کتابیں اور اردو اور انگریزی میگزین لوگوں کے درمیان فری تقسیم کی گئیں۔ سی پی ایس پاکستان کا ویب سائٹ ایڈریس یہ ہے: www.cpspakistan.org

6- ذیل میں کچھ دعوتی تجربات وتاثرات نقل کیے جاتے ہیں:

- I have been reading Al-Risala since 1983. I have also associated myself with Al-Quran Mission. I give the translations of the Quran to my non-Muslim friends. Recently, I gifted a set of the Quran in English and Hindi, What is Islam, The Prophet of Peace, The Ideology of Peace, Women between Islam and Western Society, The Purpose of Life, to the library of Delhi Public School, Nagpur. My brother, Mr. M. A. Waheed presented the same set of books to Mr A. K. Nigam, Managing Director, Forest Development Corporation of Maharashtra, Nagpur. (Mohammad Irfan, Kamptee, Nagpur)
- I am the Imam of the Islamic Center of Louisville. I have found that the Quran translated by Maulana Wahiduddin Khan is the most beneficial gift for the newcomers to Islam. I would like to personally buy this Quran translation to distribute among people who want to know about Islam, especially those in prison. (Hassan Hussien Qazzaz, Kentucky, USA)

---

# ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔ الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

## ایجنسی کی صورتیں

1۔ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 33 فی صد ہے۔ 50 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 40 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ 2۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ 3۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ایک صورت یہ ہے کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تین مہینے تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

## زرتعاون الرسالہ

| | ہندستان کے لئے | بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک) |
|---|---|---|
| ایک سال | Rs. 200 | $20 |
| دوسال | Rs. 400 | $40 |
| تین سال | Rs. 600 | $60 |

---

بھوپال (مدھیہ پردیش) میں الرسالہ اور مطبوعاتِ الرسالہ کے لئے رابطہ قائم کریں:

Yashika Books
Imami Gate Bus Stop, Imami Gate, Bhopal-462 001, M.P.
Mob: 9300908081

---

مولانا وحیدالدین خاں کا لکچر سننے کے لئے ہر اتوار صبح 10.30 بجے اس لنک پر کلک کریں:

http//:m.ustream.tv/channel/cps-intl-slow
Team CPS
www.cpsglobal.org

# عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحاد ملت
احیاء اسلام
اسباق تاریخ
اسفار ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصر حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دور جدید کا خالق
اسلام دین فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی جہاد (نئی)
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اظہارِ دین
اقوالِ حکمت
الاسلام
الربانیہ
امن عالم
امہات المومنین (ڈاکٹر فریدہ خانم)
انسان اپنے آپ کو پہچان
انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغ جنت
پیغمبر اسلام
پیغمبر انقلاب
تذکیر القرآن
تاریخ دعوت حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدید دین
تصویر ملت
تعارف اسلام
تعبیر کی غلطی
تعدد ازواج
تعمیر انسانیت
تعمیر حیات
تعمیر کی طرف
تعمیر ملت
حدیث رسول
حقیقت حج
حقیقت کی تلاش
حکمتِ اسلام
حل یہاں ہے
حیات طیبہ
خاتونِ اسلام
خاندانی زندگی (پمفلٹ)
خدا اور انسان
خلیج ڈائری
دعوت اسلام
دعوت حق
دین انسانیت
دین کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
دین و شریعت
دینی تعلیم
ڈائری 1983-84
ڈائری 1989-90
ڈائری 1991-92
ڈائری 1993-94
رازِ حیات
راہ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (پمفلٹ)
رہنمائے حیات
زلزلہ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفرنامہ اسپین و فلسطین
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
سیرتِ رسول
شتم رسول کا مسئلہ
شہادت: امت مسلمہ کا مشن (نئی)
صراطِ مستقیم
صوم رمضان
طلاق اسلام میں
ظہور اسلام
عظمت اسلام
عظمت صحابہ
عظمت قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علماء اور دور جدید
عورت معمارِ انسانیت
فسادات کا مسئلہ
فکر اسلامی
قال اللہ و قال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
کاروانِ ملت
کتابِ زندگی
کتابِ معرفت
کشمیر میں امن
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
مسائل اجتہاد
مضامین اسلام
مطالعۂ حدیث
مطالعۂ سیرت (پمفلٹ)
مطالعۂ سیرت
مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
مولانا مودودی شخصیت اور تحریک (ڈاکٹر فریدہ خانم)
میوات کا سفر
نارِ جہنم
نشری تقریریں
نئے عہد کے دروازے پر
ہندستان آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
ہند-پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2015-17
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2015-17